ترقی پسندادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر۲۳

دوسراسال: بارہویں کتاب

دسمبر۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

کمپوزنگ: اظہر خان (یونی کارن کمپیوٹرز چونگی نمبر۶ ملتان)

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِسالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

احوال:

۲۔ میرا ذہنی اور علمی سفر — ڈاکٹر معین الرحمٰن — ۵

مضامین:

۳۔ اردو ماہیا — خاور اعجاز — ۱۵

۴۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات:۱۳) — ابن حسن — ۲۱

۵۔ ہوا، دِیا اور خواب — احمد حسین مجاہد — ۳۰

تراجم:

۶۔ ملکہ شیبا کا کابوسی خواب — برٹرینڈ رسل / ڈاکٹر شگفتہ حسین — ۳۳

۷۔ ہولی — امر جلیل / رنگر چنا — ۴۰

۸۔ بھاگوان — جورنسٹرن جورنسن / نیر عباس زیدی — ۴۳

غزلیات:

۹۔ صابر ظفر (ایک غزل)، غلام حسین ساجد (دس غزلیں)، خیال امروہوی (چار غزلیں)، احمد صغیر صدیقی (چھ غزلیں)، قیوم طاہر (چار غزلیں)، حصیر نوری (چار غزلیں)، پرویز ساحر (دو غزلیں)، شام جعفری (دو غزلیں)، طارق اسد (دو غزلیں)، اوصاف نقوی (ایک غزل) حسن عباسی (ایک غزل)، ظفر اقبال نادر (ایک غزل)، اعجاز الرحمٰن قاضی (ایک غزل) — ۴۷

نظمیں:

۱۰۔ ''بابائے خیر و برکت'' (دل نواز دلؔ)، ''اب کسی کا کوئی بھروسہ نہیں''، ''انجانے خوف میں چھپا شہر''، ''پھر کوئی بات کوئی بات نہیں'' (فہیم شناس کاظمی) ''ضد کی بکل اس کی لحد ہے''، ''خالی ہاتھوں کا لمس''، ایک اور جنم کا وعدہ ہے''، ''مراجعت'' (خالد ریاض خالد) — ۷۰

حروفِ زر:

۱۱۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۷۴

سید عامر سہیل

چند باتیں

''انگارے'' کی ۲۴ویں کتاب آپ کے سامنے ہے۔ یوں ماہانہ اشاعت کا دوسرا سال تکمیل کو پہنچا۔ ان دو برسوں میں بہت سی باتیں زیرِ بحث آئیں۔ مجموعی فکری رجحانات، شخصی رویے، اداروں کی کارکردگی اور تیزی سے تبدیل ہوتا ادبی منظر نامہ، غرض ہر حوالے سے کوئی نہ کوئی نئی بحث ''انگارے'' کے صفحات پر جگہ پاتی رہی ہے۔ ان چوبیس شماروں میں جو شعری اور نثری تخلیقات شائع ہوئیں ان میں فکری اور فنی ہر دو حوالوں سے نئے فکری رجحانات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ''انگارے'' اپنی ''فکری شناخت'' کو قائم رکھتے ہوئے ہر نقطہ نظر کا احترام کرے۔ ''انگارے'' کے مندرجات کا جائزہ لیں تو مختلف الخیال لکھنے والوں کے نام آپ کو نظر آ جائیں گے، یوں یہ کتابی سلسلہ لکھنے والوں کو اوپن فورم فراہم کرتا رہا ہے جہاں ہر ایک کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ زبان و ادب کے حوالے سے ''انگارے'' کا نقطہ نظر بہت واضح ہے۔ ادب کیا ہے اور اسے کیسے ہونا چاہیے؟ ادب اور سماج کا کیا رشتہ بنتا ہے؟ جدید فکری تحریکوں اور لسانی مباحث کے حوالے سے ہماری کیا رائے ہے وغیرہ ایسے سوالات پر ''انگارے'' کا خاص موقف ہے تاہم اس شناخت کے باوجود وسیع النظری ہماری پہلی ترجیح رہی ہے۔ یہاں بحث کے دروازے کھلے ہیں ہر ایک اپنی رائے کے حوالے سے استدلال کر سکتا ہے، یہ اس کا بنیادی حق ہے اور ''انگارے'' اس بنیادی حق کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ آئندہ اسے مزید تقویت پہنچانے کا عزم بھی کرتا ہے۔

ہمارے یہاں شعر و ادب کے حوالے سے انحطاط پذیری کا رونا رویا جاتا ہے (یہ الگ بات کہ ہم خود بھی اس میں شریک ہیں) اور ہم ایک شکایتی بچے کی طرح گلے اور شکوے کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ادبی صورتِ حال بہت بہتر نہیں ہے اور دو نمبر لکھنے والے ابھرتے ڈوبتے نظر آ جاتے ہیں تاہم قطعی مایوسی کی خبریں سنانا بھی درست نہیں رویہ نہیں ہے۔ آج بھی بہت سے اہم لکھنے والے اپنا کام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ادبی رسائل اور اخبارات کی صورتِ حال دیکھیں تو آج جتنی تعداد اور معیار کے ادبی پرچے شائع ہو رہے ہیں وہ ماضی میں کم کم نظر آتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں میں اشاعت کا شعور رفتہ رفتہ ترقی پا رہا ہے۔ اب کتاب کی اشاعت جوئے شیر لانے کے مترادف نہیں رہی بلکہ بہت آسان اور سہل کا ہو کر رہ گیا ہے۔ کمرشل اداروں اور پبلشرز نے مزید آسانیاں بہم پہنچا دی ہیں۔ اس اشاعتی شعور کے جہاں فوائد ہوئے وہاں کئی نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑا مثلاً بہت سے متشاعر دنوں میں شاعر اور عرضی نویس ادیب بن گئے۔ کتابوں کی بھرمار اور ان کئے ڈیلکس ایڈیشنز نے معیاری کتابوں کو دبا کر رکھ دیا۔ لوگوں کے ادبی مزاج کو ''کچے ادب'' کی جو چاٹ لگی تو پھر ہر طرف بے روح لفظ اور سطحی جذبے آوازے کستے نظر آئے۔ شاعری اور مزاح خاص طور پر ان متشاعروں اور قینچی بازوں کے

ہاتھ آ گئے اور پھر انہوں نے ان سے سلوک بھی ایسا کیا کہ شاعری بے آبرو اور مزاح مفلوک الحال ہو کر رہ گئے۔ ادبی اخبارات اور رسائل میں بھی چند ایک ایسے ہیں جن کا ہدف ادب کی بجائے ادیب، تخلیق کی بجائے عیب جوئی اور نظریے کی بجائے روپے کا حصول تھا، یا پھر بیرون ملک مقیم لوگوں کو شاعر کی سند عطا کر کے باہر مشاعرے پڑھنے کی شدید خواہش تھی۔ ایسے کرداروں میں بہت سے اہم نام بھی ہیں اور ایسے بہت سے ہیں جو یوں بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سارے کے باوجود بہر حال لفظ کی عدالت بہت بے رحم ہے۔ اس عدالت میں جرم ثابت ہونے پر ''مجرم الفاظ'' کو ایسی سزا دی جاتی ہے کہ وہ خود اپنے تخلیق کرنے والے کی صلیب بن جاتے ہیں۔ ہاؤ ہو مچانے والوں کا ریلا آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور وہی باقی رہ جاتا ہے جو خلوص نیت سے کام کرتا ہے۔ ادب کی پہچان ہمیشہ سے ادیب اور شاعر رہے ہیں کبھی ''بھانڈ اور مسخرے'' نہیں۔

''انگارے'' کی یہ کوشش رہی ہے کہ ادب کے سنجیدہ عمل کو جاری رکھا جائے اور اب تک اس عمل کو جاری رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ یقیناً اس میں تمام لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ ہم اس تعاون کے لئے شکر گزار ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی لکھنے والوں کا قلمی تعاون حاصل رہے گا۔

''انگارے'' کی اشاعت کے تیسرے سال کا آغاز ''منٹو نمبر'' سے کیا جا رہا ہے۔ یہ اہتمام سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس حوالے سے آپ کے قلمی تعاون کی ضرورت ہے، یقیناً آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر جنوری ۲۰۰۵ء میں

انگارے کا

منٹو نمبر

شائع کیا جا رہا ہے

آپ سے گزارش ہے کہ منٹو کے حوالے سے اپنی شخصی، تنقیدی اور تحقیقی تحریریں جلد از جلد تک ارسال فرما دیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

میرا ذہنی اور علمی سفر

بھٹنڈہ، ریاست پٹیالہ، مشرقی پنجاب (بھارت) میری جنم بھومی ہے۔ ۵ر نومبر ۱۹۴۲ء قیاساً تاریخِ ولادت ہے۔ یہی میری تمام دستاویزات میں درج چلی آ رہی ہے۔ والدہ، خدا انہیں سلامت رکھے، بتاتی ہیں کہ میری ولادت کے دوسرے روز مہاراجہ پٹیالہ کے ہاں اولادِ نرینہ کا ورود ہوا اور اس خوشی میں کئی روز ریاست بھر میں جشن کا سماں رہا اور مہاراجہ کی جانب سے داد و دہش کا سلسلہ چلا اور مظاہرہ ہوا۔ مجھے اس روایت کے سہارے یا حوالے سے اپنی ولادت کی قطعی صحیح تاریخ کے تعین کا موقع نہیں ملا۔

تقسیمِ ہند کے پُرآشوب زمانے (اگست ۱۹۴۷ء) میں ہمارا مختصر سا گھرانہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر، خاک اور خون کے ہفت خواں طے کرتا ہندوستان اور پاکستان کے قصباتی طرز کے پہلے سرحدی مقام بہاول نگر پہنچا اور پھر یہی ہمارا وطن اور عافیت کدہ ٹھہرا۔ ہجرت کے اس دل دوز سفر کی کسی قدر رُوداد مجھ سے عمر میں دو برس لیکن علم اور عقل میں دو چند سے بھی بڑے بھائی متین الرحمٰن مرتضیٰ نے سفر نامے کی صورت میں لکھ دی ہے۔ ان کی یہ کتاب ''میں نے پاکستان بنتے دیکھا'' کتابی صورت میں چھپ چکی ہے۔

ابتدائی تعلیمی مدارج از سرِ نو بہاول نگر میں طے ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں بہاول کالج بہاول نگر سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا، جہاں اس زمانے میں کوئی ڈگری کالج نہیں تھا۔ بی اے، فرسٹ ایل ایل بی اور ایم اے (اُردو) میں نے کراچی سے کیا۔ ''غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ'' کے موضوع پر ۱۹۷۲ء میں مجھے جام شورو یونیورسٹی حیدرآباد سندھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہ منزل اُستادِ گرامی قدر پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی توجہ سے آسان ہوئی۔ خدا انہیں بہت عمر دے اور صحت و خرمی سے رکھے۔

ہر مُو میرے بدن کا سراپا سپاس ہے!

میں نے ۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) کیا۔ اُسی برس بطور لیکچرار سرکاری تدریسی ملازمت سے وابستہ ہوا اور اسی سال بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے متعلق، ترتیب و تحقیق کے مزاج کی میری ایک کتاب مشفق خواجہ کی مہربانی سے شائع ہوئی۔

ایم اے کرنے کے بعد، پڑھنے، پڑھانے، لکھنے اور لکھواتے رہنے کے اس سفر پر کوئی چالیس برس بیت گئے۔ اس سارے عرصے میں پڑھنا پڑھانا، بار ہونا، یا لکھنا لکھانا ناگوار ہونا تو دُور کی بات ہے، ہر رُت، ہر موسم، ہر سیشن اور لکھنے لکھانے کا ہر اگلا مرحلہ میرے لیے طاقت اور توانائی کا موجب ہوا جس

نے مجھے سدا مسرور اور مطمئن رکھا اور یہ کہنا تو زیادہ صحیح نہیں ہوگا کہ ان چالیس برسوں میں بلا استثنیٰ، میں محبت ہی کا مورد رہا، کچھ ضرور ہوں گے جن کے لیے میں قابلِ قبول نہ بھی رہا ہوں گا، پھر بھی میرا عاجزانہ احساس ہے کہ ان چالیس برسوں میں، جیسی عزت اور محبت مجھے اپنے سینئرز، اپنے رفقاء، ہم کار ساتھیوں اور شاگردوں سے ملی، میں اس پر خدائے ودود کا جس قدر بھی شکر گزار ہوں، وہ کم ہوگا۔

میری مدتِ ملازمت کے کوئی تیس برس تو ایم اے (اُردو) کے درجے کے متعلّمین کی رفاقت میں بسر ہوئے، تازہ دم، ذی استعداد اور خوش ذوق ساتھیوں کی رہنمائی کر کے، اُن کے لیے آسانیاں پیدا کر کے، مجھے جو طمانیتِ قلبی نصیب ہوئی، اُس نے میری زندگی کو ایک معنویت اور سمت بخشی۔ اعلیٰ مدارج کے میرے یہی عزیز میرا حاصل، میرا انعام اور اثاثہ ہیں۔ خدا انہیں عزت دے آسودہ رکھے توفیقاتِ مزید سے نوازے اور یہ جہاں بھی ہوں ممتاز اور منفرد رہیں۔

میں معترف ہوں کہ مجھے، اعلیٰ مدارج میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہونے کے باعث اپنے شاگردوں سے بہت کچھ سیکھنے اور پانے کا موقع ملا۔ سیکھنا تو بالکل سامنے کی بات ہے ''ان سے پایا کیا؟'' اس کے بارے میں یہاں ضرور کچھ کہنا چاہوں گا۔

میرے شخصی کتاب خانے کی کسی قدر شہرت ہے۔ ''شہرت'' تو شاید مناسب لفظ نہیں، بہرحال میرے کتب خانے کا اگر کچھ چرچا ہے تو اس کے لیے میں اپنے آپ کو اپنے شاگردوں کا احسان مند پاتا ہوں۔ یہاں، شروع ہی میں ایک اعتراف کر لینا ضروری ہے۔ خود اپنے بہت سے دوستوں کی طرح نہیں بلکہ ان کے برعکس، میں نے ''حاضر یا نقدِ علم'' کو کبھی کافی خیال نہیں کیا۔ مطالعے کو برابر جاری رکھا اور تدریس کو ہمیشہ ہر روز کنویں کا کھودنا اور اس سے پانی نکالنے کا عمل جانا اور معمول بنایا۔ اس عادت کے نتیجے میں میرا ذخیرۂ کتب پھیلتا اور پھلتا گیا۔

میری لائبریری کا (اگر اسے لائبریری کہا جا سکے) ایک گوشہ ایسی کوئی تین ہزار کے لگ بھگ کتابوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک پر پاکستان یا پاکستان سے باہر کی کوئی پینتالیس پچاس یونیورسٹیوں سے، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی، یا ڈی لٹ کی ڈگری عطا ہوئی۔ اس ذخیرے کا بیشتر حصہ تو اُردو سے متعلق ہے، اس گوشے میں دوسری مشرقی زبانوں اور انگریزی میں لکھی گئی تحقیقی مزاج کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ غیر مطبوعہ تھیسس بھی اسی ذخیرے کا حصہ ہیں اور یہ تعداداً اتنے ہیں کہ کسی دوسرے شخصی ذخیرۂ کتب میں کہیں مشکل ہی ہوں گے۔

کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے پایا اور ریزہ ریزہ جمع کیا، اعلیٰ مدارج کے اپنے شاگردوں کی ضرورت کی بنا پر ___ یونیورسٹی کی سطح کا کوئی استاد کسی موضوع پر اپنے شاگردوں سے بات کرے تو وہ اُنہیں اس موضوع کے متخصّصین سے بڑھ کر نہ بتا سکے تو کم سے کم وہ اس حد تک تو اپنے معلّمین کو اس موضوع سے واقف یا تیار کرا سکے جہاں تک کی خبر، اس موضوع کے پچھلے غواص اور غوطہ زن لا، اور پا چکے۔

کسی ربط کے بغیر یہاں ضمناً اپنی ایک عادت کا ذکر کرنا یا اس کا اعتراف کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ میں اپنی تدریسی زندگی میں بے دیکھے یا کہہ لیجیے کہ کسی نہ کسی قدر ''تیاری'' کے بغیر بالعموم کلاس میں کبھی نہیں گیا۔ میں اعلیٰ مدارج میں اپنی ذمہ داری کا کچھ نہ کچھ حق ادا کرنے کے لیے اس روشِ کار کو ضروری سمجھتا ہوں اور اسے تدریسی انتھکس کا حصہ لازم مانتا ہوں۔ خداوند تعالیٰ کا یہ مجھ پر کیسا احسان رہا ہے کہ بعض صورتوں میں کسی موضوع کا ذہن میں تعیّن کر کے کلاس میں نہیں گیا، خالی الذہن گیا لیکن بااعتماد اور مطمئن واپس آیا اور احساس ہوا کہ کلاس نے میری موجوگی اور گفتگو سے مسرت اور راحت پائی۔

اس سے میں نے یہ سبق نہیں پایا کہ ''تیاری'' کرنے کی عادت یا مشقت بے معنی ہے اور منہ اُٹھائے کلاس میں چلے جانے میں کوئی قباحت یا برائی نہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر آپ خوش نیت ہیں تو اللہ کا کرم آپ کا نصیب ضرور بنتا ہے۔ جب کبھی مجھے یکسوئی کے بغیر کلاس میں جانا پڑا، مضمحل اور شرمندہ گیا، اللہ نیت کا جاننے والا اور عزت دینے والا ہے، میں کسی خفّت کے بغیر واپس آیا لیکن کلاس میں بلا تیاری جانے کو میں نے اپنا معمول یا وطیرہ کبھی نہ بنایا۔ اعلیٰ مدارج میں پڑھانے والے اپنے رفقائے کار سے بھی میری ہمیشہ یہی گزارش اور توقع رہی۔ بہت سی صورتوں میں مجھے اس میں کامیابی بھی ہوئی۔

غالب والے عبدالرحمٰن بجنوری کے کسی خط میں، میں نے پڑھا، اپنے ایک عزیز کو اُنہوں نے بڑے کام کی بات کی تلقین کی ہے کہ پانچ یا پچاس کتابوں کو رٹنے/ حفظ کرنے کے بجائے پانچ سو کتابوں کو یکسوئی سے پڑھ لینا زیادہ باثمر اور موثر ہوگا۔ توجہ سے پڑھی گئی یہ پانچ سو کتابیں، اُس بنیاد کا کام دیں گی جو دکھائی نہیں دیتی لیکن جس پر عمارت کی پختگی اور پائیداری کا دارومدار ہوتا ہے۔

توجہ سے پڑھا گیا لوازمہ بھلے دکھائی نہ دے، لیکن وقت پڑے تو یہ ازخود آپ کے کام آتا ہے اور آپ کی مدد کو آتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا اور اپنے عزیزوں کو اس پر آمادہ کرنے اور اس کا عادی بنانے کی کوشش کی اور جنہیں میں شوقِ مطالعہ کی لَت لگا سکا، اُنہیں میں نے معاشرے کا بہت اچھا اور پُراعتماد فرد اور اپنے آپ سے بہت مطمئن پایا۔

بعض عزیز مجھے رشید احمد صدیقی کا حافظ کہتے ہیں میں اسے اپنی کمزوری نہیں طاقت جانتا ہوں، رشید صاحب ہی نہیں، غالب، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، آلِ احمد سُرور، ڈاکٹر خورشید الاسلام، قرۃ العین حیدر، نظیر صدیقی اور بعض دوسرے اکابر کو میں نے اتنا پڑھا ہے اور اس قدر تواتر سے پڑھا ہے کہ وہ ایک طرح سے میری سائیکی اور میرے اُسلوبِ نثر کا (اگر وہ کوئی ہے) جزوِ اعظم سا بن گئے ہیں۔

یہاں میں اپنے ایک دو اور پسندیدہ نثر نگاروں کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ ادا جعفری اور ضمیر جعفری کی عام شہرت شاعر کی ہے۔ میں ان کی نثر کے حُسن اور رچاؤ کا بھی بڑا گھائل ہوں۔ یہی صورت عطاء الحق قاسمی کی ہے، میں ان کے نثری اُسلوب کا بھی بڑا قائل اور قدردان ہوں۔ رشید احمد صدیقی نے بتایا ہے کہ ''ہر عقل مند شخص کے لیے دو حماقتیں ضروری ہیں۔ ایک شادی، دوسری شاعری۔''

رشید صاحب نے ''عقل مند'' ہونے کی شرط نہ رکھی ہوتی تو میرے لے اس ''اقرار صالح'' میں کوئی مضائقہ نہ ہوتا کہ میں ''ضروری حماقت'' کی دوسری شق ''شاعری'' سے محفوظ و مامون رہا۔ ''میرا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کو موزوں شعر بھی اُس وقت تک یاد نہیں رہتا جب تک اسے ناموزوں نہ بنالیا جائے۔''

میں شعر نہیں کہتا، لیکن اچھا شعر دیکھ کر، سُن کر میں اپنے آپ کو کثافت سے دُور اور لطافت سے قریب تر پاتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے میرے کام، میری نثر سے نکلتے رہے اور شعر نہ کہہ پانا کبھی میری راہ میں حائل نہ ہوا۔ میں ایسے شاعروں کا قدردان ضرور رہا جنہیں اچھا شعر کہنے کے باوجود، صاف ستھرا، سجل، باعمل اور محبت کرنے والا انسان پایا۔

یہاں اپنی تدریسی زندگی کے آغاز (۶۶-۱۹۶۵ء) کے چند نام، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، بشیر منذر، جلیل عالی، اجمل وجیہہ، راشد حسن رانا اور گلزار وفا بطور شاعر ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ مجھ سے تلمذ کی گھڑیاں ان اصحاب کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہوں گی لیکن ان سے معلّمانہ رشتہ میرا افتخار اور اعزاز ہے۔

بات بڑھتی جا رہی ہے، پھر بھی ایک دو باتیں اور کہنا چاہوں گا۔ میرے کچھ محبوب ہیں اور کچھ محبوب موضوعات، یہ بات میرے ہی جاننے والے کے علم میں ہے کہ ''تحقیق'' سے بھی میرا ایک مستقل ناطہ ہے۔ تحقیق میں ''موضوع کے انتخاب'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ''شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے'' بات شعروں کے ''انتخاب'' تک ہی محدود نہیں، میرا کچھ ایسا عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے محبوب اور موضوع کے حوالے سے بھی پہچانا جاتا اور بے نقاب ہوتا ہے۔ یا کم از کم اسے پہچانا جانا اور روشنی میں آنا چاہیے۔

غالب، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، وقار عظیم، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ منظور حسین، آلِ احمد سُرور، ''نقوش'' کے محمد طفیل، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری میرے محبوب بھی ہیں اور میرے موضوعات بھی۔ مزاجی مناسبت، اُفتادِ طبعی، زندگی کرنے کے رویّوں کے حوالے سے مجھ میں اور میرے مرکزِ نظر اشخاص اور شخصیات میں اگر کوئی خفی مناسبت دکھائی دیتی ہو تو عجب نہیں۔

ہم آپ کسی شخصیت کو توجہ دیں، اُس کی تصنیفات، اُس کی تعلیمات اور اس کے افکار کے مطالعے میں زندگی کے طویل شب و روز بسر کریں تو غیر ارادی طور پر اپنے محبوب اور موضوع کے رنگ ڈھنگ میں ضرور ڈھلتے ہیں اور اس سے بھی پہلے کی منزل تو یہ ہے کہ آپ مزاجی ہم آہنگی کے باعث ہی کسی کو اپنا محبوب اور موضوع بناتے بھی ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ بعض صورتوں میں میاں بیوی ایک طویل عرصۂ رفاقت کے نتیجے میں کچھ کچھ صورتاً بھی ہم رنگ اور ہم آہنگ سے ہوتے جاتے ہیں۔ یہی حال آپ کا اور آپ کے موضوع کا ہوتا ہے۔ ''موضوع'' کے مثبت اور منفی ہر دو پہلو کسی نہ کسی درجے میں خود آپ میں چھپے ہوتے ہیں، تب ہی آپ کوئی موضوع منتخب کرتے ہیں۔

میرا تھیسس یہ ہے کہ کسی صاحب قلم اور ہنر کو اُس کے اختیار کردہ موضوع کے حوالے سے سمجھنے

اور آنکنے کی کوشش ایک اچھی پیش رفت ہوسکتی ہے۔ ''آج'' کے بزرگ بھی اپنے وقت میں کوئی نہ کوئی مرکزِ نظر رکھتے تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری	=	نیاز فتح پوری
ڈاکٹر وزیر آغا	=	مولانا صلاح الدین احمد
احمد ندیم قاسمی	=	مولانا غلام رسول مہر
ڈاکٹر جمیل جالبی	=	جالب دہلوی
ڈاکٹر انور سدید	=	ڈاکٹر وزیر آغا

نسبتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، نوجوانوں کے لیے تو کسی نہ کسی مرکز کا پیش نظر ہونا بہت ہی ضروری ہے۔ اس سے سمتِ سفر اور راستے کا تعین آسان ہوجاتا ہے۔ جس جس نے وضع داری نبھائی اور اپنے اپنے ''میگنٹ پوائنٹ'' سے جیسا جیسا وہ جڑا رہا، اُسے اسی نسبت سے اپنے وقت میں اپنے نام لیوا بھی ملے۔ چراغ سے چراغ جلنے کا عمل خوش رنگ اسی کو کہیں گے اور اس لیے بھی، میں اس پر اصرار کرتا ہوں کہ نسبت اور نسب کو تازہ واردانِ ادب ضرور اہمیت دیں۔

رشید صاحب نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ ''ہر شخص، اپنے محبوب سے پہچانا جاتا ہے۔ جس پائے کا آپ کا محبوب ہوگا، وہی درجہ آپ کو لوگوں کی نظر میں حاصل ہوگا۔''

حالی، یا داغ دہلوی کسی کا مرکزِ نظر ہوں یا قیومِ نظر اگر کسی کا آئیڈیل ہوں، یا یگانہ چنگیزی کسی کی تخصیص، تو یہ بے سبب نہیں ہوگا۔ یہ ''انتخاب'' موضوع منتخب کرنے والے کی قدر پیمائی کا پیمانہ اور وسیلہ بھی بنے گا اور منتخب کرنے والے کی اپنی مزاجی اُفتادِ طبع تک رسائی کا سمت نما بھی! اس خود کلامی یا طرزِ احتسابی کو سمیٹتے ہوئے ایک بات مزید: مجھے اکثر اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ آخر ''غالب'' ہی کیوں! اور یہ بھی بالعموم پوچھا جاتا ہے کہ غالب پر مزید کسی کام کا کوئی امکان کیا رہ گیا ہے؟ ایک دوسرے موقع پر مجھے یہ جتایا گیا کہ میری ادبی حیثیت میں سب سے نمایاں پہلو ''تحقیق'' کا ہے اور میرا سب سے زیادہ مرغوب موضوع ہے ''غالب''! غالب تو پہلے ہی محققین اور ناقدین کی توجہ کا مرکز تھے، میں نے کسی غیر معروف ادبی شخصیت کا انتخاب کیوں نہ کیا!؟

میرا جواب یہ تھا کہ ہم ''آم'' سے محض اس لیے دُور یا محروم رہیں کہ وہ بہتوں کا مرکزِ توجّہ یا محبوبِ نظر ہے اور پیپتے یا چکوترے کا انتخاب محض اس لیے کریں کہ وہ معروف یا مقبول نہیں۔ جناب، پھر وہی بات کہ اپنا موضوع اور محبوب منتخب کرنے میں ہر شخص آزاد ہے، یا کم از کم اسے اس کی آزادی ہونی چاہیے۔ اِس طرح کے سوالات مجھ سے ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بھی پوچھا گیا کہ میں نے ''غالب'' کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر کیا غلطی نہیں کی؟

میرے نزدیک اصل مسئلہ محقق کی اپنی استعداد، توفیق اور مرکزیت کا ہے۔ اس کا کچھ حصہ

اسے اگر میسّر یا نصیب ہے تو وہ کسی معلوم موضوعِ تحقیق پر ایک بڑی بھیڑ میں بھی اپنے مختلف ہونے کا احساس دلا سکتا ہے۔

غالب کو اپنی تحقیق کا مرکز بنا کر میں لاحاصلی کی کیفیت سے کبھی دوچار نہیں ہوا۔ غالب پر اپنی پہلی کتاب ''اشاریہ غالب'' (۱۹۶۹ء) سے اب (۲۰۰۴ء) تک کا طویل زمانہ میرے لیے ایک غیر منقطع سلسلۂ نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

کوئی پینتیس سینتیس برس کے لگ بھگ میں نے غالب کے ساتھ گزارے ہیں۔ میں ''غالبیات'' کو آج بھی امکانات اور توسیعاتِ مزید سے پُر پاتا ہوں۔ ''غالبیات'' کے متعدد گوشوں سے قطع نظر جن پر کام کرنا میرے پیش نظر یا زیرِ قلم ہے، میں یہاں صرف ایک موضوع کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

غالب کے خطوط سے تو ہم سب خوب واقف ہیں۔ میں نے غالب کے نام اُن کے ہم عصروں کے لکھے گئے خطوط کی جمع و ترتیب اور فراہمی میں بھی بڑی سردردی اُٹھائی ہے۔ غالب جو ''دستاویزیت'' کے قائل نہیں تھے، کتب تاریخ و سیر اور لغات تک اپنے پاس محفوظ رکھنے کے عادی نہ تھے اور جن کی زندگی کرائے کے مختلف مکانات میں گزری، وہ اپنے نام آئے خطوں کی حفاظت کے بہ درجۂ آخر ہی روادار ہوسکتے تھے۔ اس پس منظر میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالب کے نام لکھے گئے خطوں کی تلاش اور جمع آوری میں مجھ پر کیا نہ گزر گئی ہوگی۔

مجھے میر مہدی مجروح، غلام غوث بے خبر، میرزا تفتہ، شیفتہ، ناطق مکرانی، ذکا حیدر آبادی اور بے قبر وغیرہ کے لکھے گئے، غالب کے نام اتنے خطوں کو تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی ہے کہ ایک مختصر مجموعہ مرتب کیا جاسکے غالب کے نام لکھے گئے یہ خط، خود غالب کے مزاج اور خطوں کی بہتر تفہیم میں مدد دیتے ہیں اور عہدِ غالب کے عمومی مزاج اور رویّوں کو سمجھنے میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب سے ہٹ کر بھی کچھ کام میری ترجیحات میں ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' مطبوعہ ۱۸۶۹ء کو اُردو کا پہلا ناول کہا جاتا ہے۔ میرے ذخیرۂ کتب میں ۱۸۵۵ء کا چھپا ہوا ایک قصہ محفوظ ہے جو اُردو ناول کے ابتدائی آثار سے خالی نہیں۔ میں اسے مرتب کر کے شائع کرنے کی فکر میں ہوں۔

سجاد حیدر یلدرم کی کلیات نثر و نظم کا کوئی اسّی فیصد کام میں پورا کر چکا۔ میر امّن دہلوی، سرسیّد احمد خان اور مولوی عبدالحق اُردو کے بنیادی نثر نگار کے طور پر معروفِ عالم ہیں میں نے ان تینوں بزرگوں کے اشعار کا ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے خطوں کے دس بارہ مجموعے چھپ چکے۔ اُن کے ایسے کئی سو خط میرے ذخیرے میں ہیں جو ابھی تک کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو پائے۔

بابائے اُردو کے غیر مرتّب خطوں کا ایک مجموعہ، نیز سیّد وقار عظیم کے مکاتیب اور خود اُن کے نام اہلِ علم کے خطوں کی کتابی صورت میں اشاعت کے علاوہ خواجہ منظور حسین کے نام مشاہیر کے خطوط اور خواجہ صاحب کے رقعات پر مشتمل ایک ضخیم مجموعے ''متاعِ منظور'' کی ترتیب و طباعت بھی مدت سے

میرے پیش نظر ہے اور قرض چلی آ رہی ہے۔

خواجہ منظور حسین نے اپنی معروف اور معرکتہ الآرا کتاب: ''تحریک جدوجہاد، بطور موضوع سخن'' پر اپنی عمر کے آخری ایّام میں بہت بنیادی اور بڑی تفصیلی ترمیمات کی تھیں۔ کتاب کا آخری ترمیم شدہ قلمی نسخہ میری تحویل میں ہے۔ مصنف کی قلمی ترمیمات کے مطابق عزیز تبسم ذوالفقار نے ایم فل (اُردو) کے لیے اس نسخے کو مرتب کیا ہے۔ اس علمی کام پر ریسرچ سکالر کو ڈگری مل چکی لیکن طباعت سے پہلے یہ بھرپور نظرثانی چاہتا ہے، جس کی فرصت مجھے ابھی نہیں مل پا رہی۔ اپنے ایک مشفق بزرگ مولانا حامد علی خاں کے خطوں کا ایک مجموعہ میں مرتب کر چکا۔ خدا مہلت اور مقدرت عطا فرمائے کہ یہ سب کام منظر ادب پر آ سکیں۔

اب، ایک دو باتیں اپنی اُفتادِ مزاج کے بارے میں، میں سیر و سفر کا جسے وسیلۂ ظفر کہا گیا ہے، عادی نہیں۔ اس لیے سفر کی برکات سے متمتع نہیں ہو پاتا، بایں ہمہ مجھے اس کا کوئی ملال بھی نہیں۔ مجھے اپنے گھر، اپنی کتابوں ہی میں وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔ اس صورت میں جو ارتکاز میسّر آتا ہے، اُسے میں لکھنے پڑھنے کے اپنے منصوبوں کے لیے نسبتاً زیادہ باثمر اور باعثِ برکت جانتا ہوں۔

مجھے ادبی یا سماجی تقریبات میں جو لاہور ایسے تہذیبی مرکز کا معمول ہیں اور کم و بیش ہفتے میں ایک دو بار تو ضرور ہی منعقد ہوتی ہیں، بے سبب منہ اُٹھائے شریک ہونا اور رہنا کبھی نہ بھایا۔ ان میں شریک نہ ہونے سے میں نے نقصان بھی اُٹھایا ہوگا اور عجب نہیں کہ اس کے باعث مجھ میں کچھ کمیاں رہ گئی ہیں لیکن سماجی زندگی کی یہ قربانی میں نے سوچ سمجھ کر دی ہے اس سے مجھے اپنے لکھنے پڑھنے کے کاموں اور علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے جو فرصت اور یکسوئی میسّر آ جاتی ہے اُسے میں بسا غنیمت اور بہتر سودا خیال کرتا ہوں۔

قیام پاکستان کے بعد میں نے جولائی ۱۹۵۹ء تک کا زمانہ ریاست بہاولپور کے ایک ضلعی صدر مقام بہاول نگر میں گزارا۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۴ء تک پانچ برس کراچی میں بسر ہوئے۔ پھر ۱۹۶۴ء کا ایک تعلیمی سیشن، میں نے بہاول نگار ڈگری کالج میں اُردو لیکچرار کے طور پر خدمت انجام دی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء سے اواخر ۱۹۷۳ء تک میرا وقت لاہور میں بسر ہوا۔ یہاں مجھے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو اور پھر ایف سی کالج میں تدریس کا موقع ملا۔

اوائل ۱۹۷۴ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن لاہور سے بطور سینئر پروفیسر (اُردو) میرا براہِ راست انتخاب ہوا تو مجھے گورنمنٹ کالج لائل پور (اب فیصل آباد) جانا پڑا، جہاں ایم اے (اُردو) کی کلاسز تھیں۔ فیصل آباد میں سات برس سے زیادہ شعبۂ اُردو کے صدر اور کالج کے وائس پرنسپل کے طور پر برسرِ کار رہا۔ یہاں مجھے اچھے شاگرد اور رفقائے کار میسر آئے جنہیں مجھے پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کرنے کی راہ سجھانے اور دکھانے کی خوشی میسر آئی۔

فروری ۱۹۸۱ء میں محکمۂ تعلیم حکومتِ پنجاب کے سینئر موسٹ اُردو پروفیسر کی حیثیت سے مجھے

گورنمنٹ کالج لاہور میں لے آیا گیا۔ میں یہاں پہنچا تو کالج میں ''اُردو'' کو بطور مضمون صرف بی اے کے مدارج تک پڑھایا جا رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھے شعبۂ اُردو میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے پروگرام جاری کرنے اور نصابات وضع کرانے کی عزت اور اوّلیت حاصل ہوئی۔ کوئی بائیس برس (نومبر ۲۰۰۲ء) تک گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) لاہور سے اُردو کے فل پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو اور پنجابی کے منصب پر فائز رہنے کے علاوہ مجھے پروفیسر صوفی تبسّم چیئر، پر متمکن رہنے کے علاوہ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کے طور پر ذمہ داریاں نبھانے کی عزت بھی حاصل رہی۔ ایک موقع پر سربراہِ ادارہ نے مجھ سے شعبۂ عربی اور اسلامیات کے صدر کے طور پر کام کرنے کی فرمائش کی جس سے میں نے بہ ادب معذرت چاہ لی۔ میں نے ایک عرصے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں پاکستان اسٹڈیز کے شعبے کے صدر اور ملٹری سائنس ڈیپارٹمنٹ کے صدر کے علاوہ شعبۂ فرانسیسی کے ایڈمنسٹریٹو ہیڈ کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔

میری یہ تدریسی اور انتظامی مصروفیات بھی بڑی حد تک میرے لیے مانعِ سفر رہیں۔ کئی بار کی دعوتوں کے باجود میں آزاد کشمیر نہیں دیکھ سکا۔ کراچی، لاہور میں تو مئیں مدتوں رہا، کوئٹہ بھی چند روز کے لے اہلِ خانہ کے ہمراہ جانا ہوا لیکن صوبہ سرحد کے مرکزی شہر پشاور کو میں صرف قسم کھانے کی حد تک دیکھ سکا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے ایک سال مجھے آدم جی ایوارڈ، یا داؤد ادبی انعام کے ججز کے پینل پر خدمت انجام دینے کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ اس کمیٹی کا اجلاس پشاور میں ہونا طے پایا۔ مجھے ایئر ٹکٹ بھی پہنچ گیا لیکن پھر کوئی ایسی اڑچن آئی کہ میرا پشاور جانا رہ گیا۔ یہاں ضمناً اس امر کا ذکر لطف سے خالی نہیں ہوگا کہ جنوری ۲۰۰۳ء کے شروع میں کراچی سے لاہور آتے ہوئے پی آئی اے کی فلائٹ موسم کی خرابی کے باعث لاہور نہ اُتر سکی اور اسے پشاور ڈائیورٹ کر دیا گیا۔ پی آئی اے کی اس فلائٹ کے ہم درماندہ مسافروں نے ایک شب اور اگلے دن کا زیادہ حصہ پی آئی اے کے مہمان کے طور پر پشاور میں گزارا۔ ان معنی میں مجھے پشاور دیکھنے یا اس کی مہمان نواز سرزمین پر کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔

کہنا یہ ہے کہ سفر سے میرا رشتہ دل چسپی تو رہی، ایک طرف، ایک طرح سے ''الرجی'' کا سا ہے۔ اس پس منظر میں بیرون ملک سفر پر آمادہ ہونا تو بالکل ہی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ دہلی میں سال کے سال غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک انٹرنیشنل سیمینار کا انعقاد اور اہتمام ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم اور رشید حسن خان نے لطفاً ایک بار مجھے بتایا کہ سیمینار کے لیے غیر ملکی مندوبین کا انتخاب کرنے والی کمیٹی، میری بار بار کی معذرت کے بعد، اب ہر نئے برس اس بات سے اپنے کام کا آغاز کرتی ہے کہ پہلے پاکستان سے اُن دو مندوبین کے اسماء پیش کیے جاتے ہیں جن کی تشریف آوری میں ہماری خوشی ہے لیکن جو ہماری دعوت کے باوجود تشریف نہیں لائیں گے۔

ایک نام کراچی سے ہوتا تھا اور دوسرا لاہور سے میرا ___ کراچی والے صاحبِ قلم نے تو قسم توڑ دی اور ہندوستان ہو آئے۔ مجھے اپنی مزاجی اُفتاد کے باعث بھارت یاترا کی اب تک توفیق ہوئی، نہ تحریک۔

میرا ذہنی سفر، میرے شخصی کتب خانے سے ایک گہرا معنوی رابطہ رکھتا ہے۔ ریٹائرمنٹ (نومبر۲۰۰۲ء) کے بعد سے میرا بیشتر وقت اسے سنبھالنے میں صرف ہو رہا ہے۔ اس کی تنظیم و ترتیب میں مجھے چھوٹی بہن انبساط امین عباسی اور بیٹی صباحت معین سے مدد ملتی ہے۔ میری ایک ماموں زاد بہن ثروت حسنین، جن کا تعلیمی کیریئر بڑا شاندار اور پولیٹیکل سائنس اور ماس کمیونی کیشن جن کی تخصیص ہے، پچھلے دنوں کراچی سے لاہور آئیں۔ اُنہیں میرے چھوٹے سے کتب خانے میں گھومتے پھرنے اور کام کرنے کی آزادی رہی۔ پہلے مرحلے پر اُنہوں نے میرے ذخیرۂ کتب سے ایسی ایک سو کتابوں کی فہرست تیار کی جو ایک سو سال سے زیادہ (کوئی پونے دو سو سال تک) کی پرانی چھپی ہوئی ہیں۔ اُنہوں نے ایسی مطبوعات کی طویل یادداشتیں بھی تیار کی ہیں جن کی طباعت و اشاعت پر پچھتر (۷۵) سے ایک سو سال تک کا زمانہ گزر چکا، یہ مطبوعات نادر و نایاب کی ذیل میں آتی ہیں۔

اپنی لائبریری کے مخطوطات یا شعبۂ غالبیات، کا میں ذکر نہیں کرتا لیکن ''اقبالیات'' کے سلسلے کا میرا ذخیرہ خاصا بھرپور ہے جس کی توضیحی فہرست ایم فل کے مقالے کی متقاضی ہے۔ یہ کام ہو جائے تو میں اس ذخیرے کو جی سی یونیورسٹی لاہور یا کسی دوسری جامعہ کی تحویل میں دے دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

میرے ذخیرے میں پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے وغیرہ کے لکھے گئے غیر مطبوعہ تھیسیز کی بھی بڑی تعداد متوجہ کرتی ہے۔ یہ تعداداً تین سو کے قریب تو ضرور ہوں گے۔ پی ایچ ڈی اور ایم فل (اُردو) کے مقالات کے تعارفی جائزے پر مبنی ایم فل (اُردو) کی ڈگری کے لیے ایک ریسرچ اسکالر کام کر رہی ہیں۔

ایم اے (اُردو) کے تھیسس تعداد میں زیادہ ہیں۔ انہیں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۸۳ء (تیس برس) اور پھر ۱۹۸۴ء سے سال ۲۰۰۴ء (بیس اکیس سال) کے دو زمانی ادوار میں تقسیم کر کے توضیحی اشاریے پر مبنی دو تھیسس لکھے جانے کی بڑی گنجائش ہے۔ یہ تجویز رُو بہ عمل آ سکے تو میں اپنے تھیسیز کے ذخیرے کا ایک حصہ بھی الگ کرنے کو ترجیح دوں گا تاکہ ان سے استفادے کا دائرہ بڑھ، اور پھیل سکے۔

اُردو شعر و ادب کے اکابر اور اپنے معاصرین کے خطوں کا ایک بڑا نادر ذخیرہ میرے کتاب خانے کا ایک نمایاں امتیاز ہے۔ خطوں کی جمع و ترتیب اور اشاعت و طباعت کا کام ان دنوں میری پہلی ترجیح ہے۔

قرۃ العین حیدر کہتی ہیں کہ اب خط نویسی کا کلچر نہیں رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسانی مصروفیاتِ کار بہت بڑھ گئی ہیں، مہلت ناپید ہے اور ہم وقت کے ہاتھوں رہن ہیں پھر فون، فیکس، ای میل اور پیام رسانی کے دوسرے تیز رفتار ذرائع نے ''خطوط'' کو پیچھے دھکیل دیا ہے، بایں ہمہ میرے نزدیک خط انسانی تعلقات کی شاخوں پر لگے یا اُگے ہوئے پھولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک حُسن ہے ان سے مکتوب نگار کی خوشبو اور اس کے لمس کی لپٹیں اور مہکاریں آتی ہیں۔ خط لکھنے کا چلن ترک نہیں ہو سکتا، نہ اس

کا سا لطیف بدل ممکن ہے۔

ایک مغربی شاعر نے لکھا ہے کہ لوگ ''ڈاک کی گاڑی'' (پوسٹ مین) کا انتظار کرتے ہیں اور اگر کسی کا خط نہیں آیا تو اس کا مطلب ہے کہ اُسے فراموش کر دیا گیا ہے اور نظر انداز یا فراموش ہونا کون پسند کرتا ہے۔ میرے ذخیرۂ کتب کا ایک گوشہ اہلِ علم و فن کے مطبوعہ مجموعۂ مکاتیب پر مشتمل ہے اور یہ بھی خاصا ثروت مند ہے۔

اب ایک آخری بات، میں خط کا جواب دینے کو اپنے لازمی اخلاقی فرائض میں شمار کرتا ہوں، (اِلّا یہ کہ مجھے اندازہ ہو جائے کہ خط لکھنے والا محض برائے بیت خامہ فرسائی کا عادی ہے) میں کسی کو خط لکھوں یا اپنی کوئی تالیف یا تحریر بھیجوں اور جواباً رسید نہ پاؤں تو اس سے مجھے ایسا ہی آزار پہنچتا ہے، جیسے کسی نے میرے مخلصانہ سلام کا جواب دینا گوارا نہ کیا ہو۔ اب چند برس سے میں نے یہ روش اختیار کر لی ہے کہ ایسا ''حُسنِ سلوک'' روا رکھنے والوں سے میں مراسلت سے یکسر اجتناب کروں۔ اپنے ان کرم فرماؤں کے بارے میں خوشی یا غم کی کوئی اطلاع پاتا ہوں تو خط لکھتا ضرور ہوں، لیکن پوسٹ نہیں کرتا۔ ہاں، اس معاملے میں میرے ہاں ایک استثنیٰ ضرور ہے۔ برادرم سحر انصاری صاحب سے میرا ایک طرفہ سلسلۂ مراسلت جاری رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ سرے سے مراسلے کے آدمی ہی نہیں، مکالمے کے تاجور ہیں۔ کبھی از خود، یا جواباً اُن کا خط، یا زبانی طیور کی اُن کا کوئی پیغام آ جائے تو وہ دن اور لمحہ میرے لیے بڑا یادگار ہو جاتا ہے۔ اپنی اس گفتگو یا خود کلامی کو سحر انصاری ہی کے ایک بے مثال اُستادانہ شعر پر ختم کرتا ہوں۔

ہمیں اندازہ رہتا ہے ہمیشہ دوست دشمن کا
نشانی یاد رکھتے ہیں، نشانہ یاد رکھتے ہیں

(نظر ثانی و اضافہ: اگست ۲۰۰۴ء)

☆☆☆

خاورا عجاز

اُردو ماہیا

ماہیا مسلّمہ پنجابی صنفِ سخن ہے اور پنجابی زبان میں ایک مخصوص وزن اور ترتیب رکھتی ہے۔ دیگر پنجابی/ اُردو اصنافِ سخن کی طرح ماہیا کا وزن، ترتیب اور موضوعات اس صنف کے روایتی، تاریخی اور علمی پس منظر کی دین ہیں جو قارئین اور شعراء کے مابین قابلِ قبول ہو چکے ہیں۔ اس قبولیتِ عام کی وجوہات میں پہلی ماہیا کی صنف کی ایجاد اور دوسری پنجابی ادب میں اس کی ضرورت سمجھی جا سکتی ہے۔ لکھنے والے کے پاس کسی بھی صنفِ ادب کا کوئی نہ کوئی جواز ضرور موجود ہوتا ہے چاہے یہ جواز محض ایک نئی صنفِ ادب کو متعارف کرانا ہی کیوں نہ ہو لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر صنف کے موضوعات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آتی ہے اور بعض اوقات یہ تبدیلی موضوعات سے گزر کر اُس کی ترتیب، اوزان حتیٰ کہ ہیئت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ بات جاننے کے لیے کہ داستان کے ٹکڑوں کو افسانہ کہنے میں کیا ہرج ہے یا غزل کو حصۂ نظم کیوں نہیں کہا جا سکتا ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ آخر وہ کون سے عناصر ہیں جو ایک صنف کو دوسری سے الگ کرتے ہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے جسے مختصراً اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ اوّلیت خیال کی ہے جو اپنے ساتھ ہیئت بھی لے کر آتا ہے یا یوں سمجھیے کہ خیال کو بیان کرتے ہوئے یا الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے اُس کی ہیئت بھی بنتی چلی جاتی ہے۔ غزل کو لیجیے، اس کی بحروں پر کوئی پابندی نہیں یعنی ابتدا ہی سے اس کی عمارت میں اتنی گنجائشیں موجود تھیں جو شاعر کے جذبوں کو اوزان کی حد تک مطمئن کرتی آئیں۔ اگر غزل کے لیے چند بحریں مخصوص ہوتیں تو شاید آزاد غزل بہت پہلے معرضِ وجود میں آ چکی ہوتی لیکن یہ عمل اتنی دُور آ کر اس لیے ہوا کہ بحروں کے بعد موضوعات کی آزادی نے غزل نگاروں کو اتنی سہولتیں مہیا کیے رکھیں کہ اُنہیں غیر مردف غزل سے آگے سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ صنف کی پہچان ہیئت سے ہوتی ہے لیکن کیا ہیئت ہی سب کچھ ہے۔ میرے خیال میں تو ایسا نہیں۔ کسی صنف کی پہچان محض اُس کی ہیئت نہیں، اُس کا مزاج بھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ماہیے کا اصل مزاج کیا ہے۔ ماہیا لکھنے اور پڑھنے والے جانتے ہیں کہ غنائی آہنگ ماہیے کی پہلی شرط ہے۔ بغیر نغمگی اور رس کے ماہیا اپنا مزاج کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے موضوعات میں شکوہ و شکایت، غم و درد، ہجر و وصال، وداع اور وچھوڑے کے علاوہ انتظار بہت نمایاں ہیں جو سب کے سب انسانی جذبوں سے براہِ راست منسلک ہیں۔ تصویر کشی جو کہ اُردو شاعری کا ایک بڑا ستون ہے، ماہیے کا جزو نہیں بنتی۔ اسی طرح فلسفہ ماہیے کے مزاج کو اتنا بوجھل کر دے گا کہ وہ ماہیے کے پیندے سے باہر نکل جائے گا۔ حمد و نعت کے مضامین ماہیے میں موزوں نہیں لگتے۔ ماہیے کے مزاج کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی

صاحب نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''کسی بھی صنف کا کوئی مزاج مقرر نہیں کیا جا سکتا۔'' (اُردو ماہیے کے خدوخال، ص ۱۰، مرتبہ: عارف فرہاد، راولپنڈی) اس بیان میں زور اگر ''مقرر'' پر رکھیں تو بات زیادہ قابلِ قبول ہو جاتی ہے یعنی مزاج تو ہوتا ہے لیکن وقت کے تقاضوں اور نئے شعراء کی اختراعات کے ساتھ تبدیل بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ قاسمی صاحب نے آگے چل کر کہا بھی ہے کہ ''غزل کا مزاج معین ہوا تھا۔۔۔ غالب اور اقبال اور فراق نے۔۔۔ اس کے مزاج کے گرد کی چار دیواریاں گرا دیں۔'' یعنی غزل کا مزاج معین ہونے کے بعد اپنی چار دیواری پھلانگ کر نئی حدود میں داخل ہو گیا گویا غزل کے مزاج میں وسعت آ گئی اور وہ معاملات، افکار اور خیالات جو غالب، اقبال اور فراق سے پہلے مفقود تھے، در آنے لگے یا ویسے نہ رہے جیسے ان شعراء سے پیشتر تھے۔ اسی طرح مجید امجد اور ن۔م۔ راشد کی نظم کا مزاج وہ نہ رہا جو حالی اور محمد حسین آزاد کا تھا۔ غزل اور نظم میں مزاج کی یہ تبدیلیاں زیادہ تر دو وجوہات کی بنا پر آئیں۔ ایک تو یہ اصنافِ سخن اُردو کی بڑی اصناف تھیں جن میں ''کچھ اور چاہیے وسعت'' کے تحت پھیلاؤ کی گنجائشیں بنتی چلی گئیں اور دوسرے انہیں شاعر بھی نسبتاً بڑے اور وافر میسر آئے۔ جہاں تک مزاج کا تعلق ہے اس کی حدیں اگرچہ مقرر نہیں تاہم ان دونوں بڑی اصناف کو محض اور محض ہیئت کی بنیاد پر شناخت مہیا نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً

رب کا شکر ادا کر بھائی - جس نے ہماری گائے بنائی

مزاجاً غزل کے مطلع سے زیادہ نظم کا ابتدائی شعر معلوم ہو گا حالاں کہ ہیئت کے لحاظ سے یہ شعر غزل کا مطلع کہلانے کا مستحق ہے۔ اسی طرح اپنے بنیادی عناصر، جو اس کا مزاج بناتے ہیں، سے عاری لائنیں ایک جگہ جمع ہو کر بھی نظم کا روپ اختیار نہ کر پائیں گی۔ بالکل اسی طرح ماہیا اپنی ہیئت اور مزاج کے ہمراہ ہی ماہیا بنے گا۔ ماہیے کے مزاج کا بنیادی وصف ماہیے یعنی محبوب کے حوالے سے باتیں کرنا ہے اور محبت یا محبت کا تصور ماہیے کا لازمہ ہے۔ اوّلین اُردو ماہیوں میں یہ وصف پنجابی اور پنجابی روایت و ثقافت کے حوالے سے بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اک بار تو مل ساجن - آ کر دیکھ ذرا - ٹوٹا ہوا دل ساجن

تارے گنواتے ہو - بن کر چاند کبھی - جب سامنے آتے ہو (ہمت رائے شرما)

بعد کے اُردو ماہیا نگاروں نے موضوعات کو بہت وسعت دی لیکن بعض اُردو ماہیا نگار ایسا کرتے ہوئے اصل ''ماہیے'' کو بھول گئے جس کا ذکر ایک محور کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتیجتاً حمد و نعت سے لے کر معاشی موضوعات تک ماہیے کے عنوان سے آنے لگے جن میں وہ چاشنی تو درکنار جو ''ماہیے'' کی وجہ سے تھی، موضوعات کے اعتبار سے بھی ماہیے کی صنف اپنے بنیادی عنصر سے اتنی دُور ہٹنے لگی کہ محض تین مصرعوں کا مجموعہ نظر آنے لگی۔ ہیئت یقیناً ہر صنف کو ایک بنیادی پہچان فراہم کرتی ہے۔ غزل کی ہیئت ردیف و قافیہ سے غیر مردف، غیر مقفیٰ، نیم پابند اور آزاد غزل جیسی تجرباتی ہیئتوں سے گزرتے ہوئے بھی

روایت اور مزاج کے بل بوتے پر غزل ہی رہی۔ نظم نے پابند سے آزاد نظم تک کے سفر میں اپنے مزاج کو برقرار رکھا۔ ہائیکو کی ہیئت پر اتفاق نہ سہی لیکن مزاج پر کوئی اختلاف بھی نہیں۔ ماہیے کا مزاج، جیسا کہ میں نے عرض کیا، محبوب کی، محبوب سے اور محبوب کی طرف سے باتیں ہیں جن کا اصل محرک محبوب ہی ہے۔ پس منظر دیہی ہو یا شہری، زبان پنجابی ہو یا اُردو، پہلا مصرع قافیہ پیمائی کے لیے ہو یا مربوط، بحر متدارک ہو یا ہزج، مصرع ایک ہو، ڈیڑھ یا تین یہ سب اضافی ہیں۔ ماہیے میں محبوب کی مرکزیت سے جو نغمگی اور تڑپ، جذبہ اور احساس کی پیوندکاری سے ابھرتی ہے وہ دوسرے موضوعات میں نہیں ہو سکتی۔ مثلاً محبوب کو مرکز مان کر کہے گئے ماہیے ملاحظہ کیجیے:

کچھ ملتا ہے مانگے سے - ہاتھ پکڑ ساجن - میں اُتروں تانگے سے (امین خیال)
گندم کی کٹائی پر - چھوڑ دیا گاؤں - گوری کی سگائی پر (حیدر قریشی)
جھوٹے افسانے میں - کیسے ملتے ہم - بے درد زمانے میں (عارف فرہاد)

اس کے مقابلے میں وہ ماہیے دیکھیے جن میں محبوب کی بجائے دوسرے موضوعات پر توجہ دی گئی ہے۔

ہر رنگ بگاڑا ہے - رُت کا ستم دیکھو - فصلوں کو پچھاڑا ہے (نذیر فتح پوری)
ہجرت کا گلہ کیا ہے - ہم ہیں خدا کے اور - ہر ملک خدا کا ہے (اجمل پاشا)
میں لوحِ جہاں پر ہوں - دیکھ مری جانب - میں حرفِ مکرر ہوں (فراز حامدی)
اک فتنہ سروں میں ہے - لوگ سنبھل جائیں - لرزش سی گھروں میں ہے (آصف ثاقب)

میرے اصرار کے بغیر آپ خود ہی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اوّل الذکر ماہیوں میں جو لوچ، درد اور کسک ہے، موخر الذکر ماہیے اُس سے خالی ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنے میں چنداں دشواری نہیں کہ ماہیے کا مزاج متعین کرنے میں محبوب کا کردار اور اُس کا ذکر بنیادی عوامل ہیں اور یہی ماہیے کا اصل مزاج ہے۔

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے اس دَور میں لکھے جانے والے ماہیوں میں دو رجحان بڑے واضح ہیں۔ ایک تو لوکیل کے حوالے سے اُن جگہوں یا علاقوں کا ذکر جہاں ماہیا نگار قیام پذیر ہے یا رہا ہے اور دوسرا ایسے الفاظ اور ماحول کی دراندازی جو سراسر شہری ہے اور جس پر مغربیت کے سائے ہیں۔ پہلے رجحان کی شاعری دنیا کی دوسری زبانوں کے شعری ادب میں بھی ملتی ہے لیکن اُردو ماہیے کے حوالے سے ہم اسے پنجابی ماہیے کا تتبع ہی کہیں گے۔ اس رجحان کی کئی سطحیں ہیں۔ پہلی سطح شاعر کا وہ بنیادی رومانی تجربہ جس کے تار و پود سے اُس کی شاعری کی شاخیں پھوٹیں۔ ان میں ماہیے کی شاخ نے اپنے ماحولیاتی پیرائے کے سبب شاعر کو کسی علاقے سے اپنے جذباتی لگاؤ کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ ایسے ماہیوں میں وہ ماہیے اوّلیت رکھتے ہیں جن میں بے ساختہ محبوب کی محبت اور اُس سرزمین کا ذکر ہے جہاں اس محبت نے آنکھ کھولی۔ پہلے وہ ماہیے دیکھیے جن کا جغرافیائی تعلق پاکستانی علاقوں سے بنتا ہے۔

چنبیلی کی گلیوں میں - خوشبو رہتی ہے - نوشہرہ کی گلیوں میں (عارف فرہاد)
یادوں کے خزینے میں - خانپور اپنا تو - آباد ہے سینے میں (حیدر قریشی)
لوٹوٹ گیا سپنا - بالاکوٹ میں بھی - اب کوئی نہیں اپنا (احمد حسین مجاہد)
اک چشمہ بہتا ہے - شہر کراچی میں - مرا ساجن رہتا ہے (سلیم احمد سلیم)
اک ضلع ہزارہ ہے - ماہی سے میرا - مشکل ہی گزارا ہے (محمد وسیم انجم)

پنجاب کی زمین سے اُگنے والے ماہیے کے پودے میں پنجاب کا ذکر نہ آئے، یہ ہو نہیں سکتا۔ چند ایسے ماہیے ملاحظہ کیجیے جن میں پنجاب از خود ماہیے کا حصہ بن گیا ہے۔

ہم خواب میں جائیں گے - ماہیا کہنے کو - پنجاب میں جائیں گے (ریاض بجنوری)
احباب کی مٹی سے - ماہیے ابھرے ہیں - پنجاب کی مٹی سے (شارق عدیل)

اب کچھ ایسے ماہیے جن میں پاکستان کے پڑوسی علاقوں کا ذکر ملتا ہے:

چاندی کی کٹوری ہے - کابل کی لڑکی - ہر چیز سے گوری ہے (عارف فرہاد)
شملے کا دسمبر ہے - رات کٹے کیسے - پردیس میں دلبر ہے (شباب للت)
اک دریا بہتا تھا - عاشق ماہیے کا - برہ پور میں رہتا تھا (صابر آفاقی)
پردیس میں رہتے ہیں - دلی کے جنگل میں - دکھ پنڈی کے سہتے ہیں (پروین کمار اشک)

اور ماہیے میں علاقائی تذکرہ کا آخری دائرہ سمندر پار کے شہروں اور براعظموں کو چھوتا ہے۔

کوئی سا واچولا ہے - سوہنا جگ بھر میں - مرا عربی ڈھولا ہے (زاہد امین)
تجھ کو جو میں پاؤں - ابوظہبی میں بھی - تیرے نغمے گاؤں (رقیہ منیر)
پیرس کی ہے دوشیزہ - ہاتھ میں چھتری کا - اک پھول ہے پاکیزہ (سجاد مرزا)
چمکیلے ستارے ہیں - یورپی لڑکی کے - کیا وارے نیارے ہیں (ارشد اقبال آرش)
وہ حسن و رعنائی - ایک حسیں دیکھا - نیپال کی یاد آئی (صابر آفاقی)
سب کو ہی سنایا ہے - خط مرے ساجن کا - انگلینڈ سے آیا ہے (عاصی کاشمیری)

دوسرا واضح رجحان ایسے انگریزی الفاظ کا استعمال ہے جو یا تو عرصے سے مستعمل ہیں یا پھر اُن کو ایسے جدید شعرا نے برتا ہے جو زیادہ تر شہروں میں رہائش پذیر ہیں اور دوسری اصنافِ سخن میں بھی اس نوع کے الفاظ لانے میں قباحت محسوس نہیں کرتے۔ تاہم ایک حقیقت مسلّم ہے کہ علاقائی زبانوں کے برعکس بدیسی زبان کے الفاظ ایک Patch کی صورت نظر آتے ہیں اور الگ سے دکھائی دیتے ہیں، آپ بھی دیکھیے:

کوئی یہ نہ سمجھ جائے - زلف مری سے تری - سگریٹ کی مہک آئے (ترنم ریاض)
کیا بات ہے اے دلبر - کارڈ نہ کیوں بھیجا - اس عید کے موقع پر (احمد کمال حشمی)

کوٹھے پر بانس دھرے - تھاپ پہ ڈھولک کی - اک لڑکی ڈانس کرے (اختر رضا سلیمی)
ممکن نہیں چھپ جانا - انٹرنیٹ میں تجھے - ڈھونڈے ترا دیوانہ (ارشاد ہاشمی)
دیوانہ لگتا ہے - پیانو بجاتے ہوئے - وہ اچھا لگتا ہے (اسلم حنیف)
ٹی وی پہ ڈراما ہے - چھوڑ نہیں دینا - مرا ہاتھ جو تھاما ہے (رستم نامی)
تجھ سے یارانہ ہے - کالج میں تو بس - پڑھنے کا بہانہ ہے (انور مینائی)
کب دل سے لگایا ہے - کالر پر اس نے - اک پھول سجایا ہے (مسعود ہاشمی)
ململ کا سوٹ لیا - پہلی نظر میں ہی - تم نے مجھے لوٹ لیا (ناصر نظامی)
بیٹھا ہوں کسی بس میں - خواب ترے اُترے - آنکھوں کے کینوس میں (نعیم عارفی)

کہیں کہیں ماہیا نگاروں نے ایک سبب کم والے مثلث بھی تخلیق کر ڈالے ہیں۔ مثلاً

خاموش نگاہوں میں- کب سے کھڑا ہوں میں- آ جا مری بانہوں میں (ذوالفقار احسن)
جذبات کا دھارا ہو - ساتھ تمہارا ہو - دریا کا کنارا ہو (آصف ثاقب)

خالد پرویز کنول کا ایک ماہیا قافیے کی پابندی سے آزاد نظر آتا ہے:

کوئی سڑک پہ بس جائے - چہرہ چھپا گوری - تجھے نظر نہ لگ جائے

اور طفیل خلش کے اس ماہیے کو کیا کہیں گے:

گھر گھر میں نہیں کھاتا - بھوک سے مر جانا - پردیس نہیں جانا

کہیں یہ سب ''آزاد ماہیے'' کی طرف پیش رفت تو نہیں!

اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے میں دورِ حاضر کے ایک رویّے کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جو Deconstruction کا رویّہ ہے۔ یہ رویّہ ہمارے ہاں ادب کے علاوہ معاشی اور معاشرتی سطحوں پر بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ ادب میں اس رویے کے زیرِ اثر جو پیش رفت دکھائی دیتی ہے وہ دیگر سطحوں کے ساتھ ساتھ اصنافِ ادب کی ہیئت میں تبدیلیوں کی خواہش ہے جس کے تحت افسانہ، غزل، نظم وغیرہ کی کلاسیکی ہیئتوں کو مسمار کر کے اُن کے باطن میں نئی گنجائشوں کی تلاش نے محض ہیئت کو اہمیت دینے والے اذہان کو ایک لمحۂ فکریہ مہیا کیا ہے۔ یہ توڑ پھوڑ جو اِس وقت گراں گزر رہی ہے دراصل کسی آنے والے نئے تعمیری ادبی دَور کے لیے ذہنی زمین ہموار کر رہی ہے۔ میں اس عارضی توڑ پھوڑ کو ظاہری ہیئتوں کے باطن میں چھپی ہوئی گنجائشوں کی تلاش سے تعبیر کرتا ہوں۔ چونکہ یہ عمل کئی ایک اصنافِ ادب میں بیک وقت ہو رہا ہے لہٰذا یوں لگتا ہے جیسے اس عہد کے ذہنِ جدید میں اُبھرنے والے خیالات کو ایسی وجدانی ہیئتوں کی تلاش ہے جو مختلف خانوں میں بٹی ہوئی خارجی ہیئتوں کے نظام کو مزاج کے اعتبار سے نئے روپ عطا کر سکیں۔ اُردو ماہیے میں یکساں مصرعوں کا تجربہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی قرار دی جا سکتی ہے اور اگر دیکھا جائے تو جو مزاج ایک سبب کم والے ماہیوں میں ملتا ہے، ذیل میں دیئے گئے یکساں مصرعوں کے ماہیوں

میں وہی مزاج بدرجۂ اتم موجود ہے۔

دریا سے اُڑے بگلے - اب اُس کی محبت میں - وہ بات کہاں پگلے (علی محمد فرشی)
کچنار پہ پھول آئے - یوں لگتا ہے جیسے کچھ - ترے گاؤں میں بھول آئے (نصیر احمد ناصر)
کنگن ہے کلائی میں - گھر والوں سے چھپ چھپ کر - روتی ہے جدائی میں (سیّدہ حنا)

اب چند ماہیے ایک سبب کم والی ہیئت میں بھی دیکھتے چلیے:

پپلی کی چھاؤں میں - جھانجھر بن جاؤں - پہنو گی پاؤں میں؟ (امین خیال)
دل درد کا ساگر ہے - ہتھ نہ بڑھا سجنا - مرے سر پر گاگر ہے (بشریٰ رحمان)
ہیرا ہے یہ دل میرا - لونگ میں لگوا لے - نقصان ہے کیا تیرا (قاضی اعجاز محور)

آپ نے دیکھا کہ اصل مسئلہ مزاج کا ہے۔ ہیئت کا نہیں۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات (۱۳)

ادب اور معروضی حقیقت

احمد حسین مجاہد

ہوا، دِیا اور خواب

میرؔ کے جمال کو معیار مان لیں تو غالبؔ کے جلال کا کیا کریں۔ اس سلسلے کو ذرا اور آگے بڑھاتے ہوئے اقبالؔ تک لے آتے ہیں۔ اقبالؔ، غالبؔ کا معتقد، غالبؔ، میرؔ کا پرستار، تینوں کا اپنا اپنا طرزِ سخن لیکن تینوں ہی قدآور اور تینوں ہی معیار۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ ہم میرؔ کو میرؔ، غالبؔ کو غالبؔ اور اقبالؔ کو اقبالؔ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ ہمیں میرؔ سے جو توقع ہے وہ غالبؔ سے ہرگز نہیں۔ اقبالؔ سے ہمارا مطالبہ وہ نہیں جو غالبؔ سے ہے، لہٰذا ہم خوش، ہمارا خدا خوش!

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا تو ہماری تنقیدی اصطلاحات میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا ہوتا اور ہمارے اندازِ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہو چکی ہوتی مگر پھر یوں ہوا کہ ہم نے شاعری کو ایک طرف رکھ دیا اور قوالوں میں بیٹھ کر تالیاں پیٹنے لگے۔ اب کہیں سے کوئی تازہ آواز اُبھرتی بھی ہے تو ہماری بلا سے!

آئن سٹائن اور سٹیفن ہاکنگ کو پڑھتے ہوئے مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ میں نے جانا کہ میں نے اپنے بازوؤں میں جو خلا بھر رکھا ہے وہ صرف میرا ہے۔ میری آنکھ جس منظر پر لگی ہوئی ہے اور جس طرح میں اس منظر کو دیکھ رہا ہوں، دنیا کا کوئی دوسرا آدمی اس منظر کو میری طرح قطعاً نہیں دیکھ سکتا۔

مجھے آئن سٹائن نے بتایا کہ میری ہستی اس کائنات کے لیے کتنی ناگزیر ہے۔ تب مجھ پر 'جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے' کے معنی کھلے۔

چلیے! میں آپ کو احمد حسین مجاہد کا ایک شعر سناتا ہوں۔ یہ شعر سن کر آپ کو بالکل مزہ نہیں آیا۔ مزہ تو اب آئے گا جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ یہ شعر احمد حسین مجاہد کا نہیں، میرؔ کا ہے۔ اب آپ پر شعر کھلنا شروع ہوگا۔ بہت ممکن ہے آپ اسے ایک بڑا شعر قرار دیں کیونکہ میرؔ سے آپ کی توقعات ذرا دوسری نوعیت کی ہیں۔ مان لیجیے کہ شعر کسی کا بھی، اُس کا مضمون چاہے کچھ بھی ہو، آپ اُسے اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ مان لیجیے کہ یہ مفروضہ بھی حتمی نہیں۔ آخر ظفر اقبال بھی تو اپنی بھینس والی شاعری کو بڑے بڑے ناقدوں سے منوا چکا ہے۔

بات بہت طویل ہوگئی۔ آئن سٹائن نے میری اس ساری تمہید کو صرف ایک لفظ Relative میں سمو کے رکھ دیا ہے۔ ادب پر اس لفظ Relative کا اطلاق کیسے ہوتا ہے، اس پر تفصیلی گفتگو پھر کبھی سہی۔

پرویز ساحر کا اوّلین شعری مجموعہ ''ایک پرہوا کا'' جب سامنے آیا تھا تو ایک دفعہ تو بڑے بڑوں نے مڑ کر اس نوجوان کی طرف دیکھا تھا جس کا بدن کسی کے درد نے اوڑھا ہوا ہے۔ دل میں کہیں شاید اعتراف کی چنگاری پھوٹی ہو مگر بھرپور تحسین کی نوبت نہیں آسکی تھی۔ پرویز ساحر بھی چپکا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ غالب طعنے دے کر بھی کام نہ نکال سکا مگر پرویز ساحر کی شاعرانہ تعلّیاں دلوں میں کھٹکنے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُسے جو طعنۂ یکتائی دیا جاتا ہے، وہ اُسے خوب جچتا ہے۔

''دیئے کا کنارہ'' نے واہ واہ بھی سمیٹی، نعرہ ہائے تحسین بھی بلند ہوئے، مکالمے نے بھی جنم لیا، رقیبوں نے جا جا کے رپٹ بھی لکھائی، تنقیص کی چھری بھی چلی اور خدا خدا کر کے پرویز ساحر متنازعہ ہو گیا لیکن میرا مسئلہ سرِ دست کچھ اور تھا۔ مجھے پرویز ساحر کی عجلتوں سے خوف آنے لگا تھا۔ روز و شب فکرِ شعر نے اہلِ شعور کے لیے اُسے مشکل بنا کے رکھ دیا تھا اور ہم جیسے سادہ دلوں کو گھائل کر دیا تھا۔ میں اُسے روک لینا چاہتا تھا لیکن اعتراف کے اتنے چراغوں کے درمیان ٹمٹماتا ہوا انکار کا ایک دیا کیا کرتا۔ پرویز ساحر وقت کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تیر کے مانند ہے، اُس کی رفتار اُس کے بس میں بھی نہیں۔ وہ بلا کا زُود گو ہے۔ بے پناہ محبت کرنے والا، بالکل یونانی اساطیر کے کسی بے پناہ کردار جیسا۔ اچھے شعر کا متلاشی اور سینے کی پوٹلی میں اچھے اشعار کا ایک خزانہ چھپائے ہوئے۔ عروض کی بھول بھلیاں سے رواں دواں گزرتا ہوا پرویز ساحر، اُردو شاعری کی روایت سے بخوبی آگاہ ہے، شاید بلکہ یقیناً اسی لیے وہ دلیل کے بغیر قائل نہیں ہوتا۔

''آسمانی خواب'' اُس کا اب تک کا آخری شعری مجموعہ ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں پرویز ساحر کے سارے شعری سفر کو تین لفظوں میں بیان کروں تو میں کہوں گا، ہوا، دیا اور خواب! اُردو شاعری کی تین بڑی علامات ___ علامتوں کے ساتھ اگر آپ کو ان کے متعلقات بھی چاہئیں تو آپ ہوا کے ساتھ ٹوٹا ہوا پر، دیئے کے ساتھ کنارہ اور خواب کے ساتھ آسمانی کا اضافہ کر لیجیے، بات آئینہ ہو جائے گی۔

چونکہ ہماری پرورش غزل اور غزل کی روایت کے سائے میں ہوئی ہے اور یہ کافر ادا اپنے اختصار اور ایجاز و ایماء کے لیے بدنام ہے اور یہی بدنامی اس کا اعزاز بھی ہے، اس لیے میں ان علامتوں کی مزید وضاحت نہیں کروں گا کہ غزل اور غزل کی روایت کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

''آسمانی خواب'' تک آتے آتے پرویز ساحر کی آنکھ کی پتلی میں ساری کائنات سمٹ آئی ہے یہ اُس کا افتخار ہے کہ وہ اپنی کائنات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اُس کا اُسلوبِ سخن بالکل منفرد ہے۔ یہ نہیں کہ وہ متاثر نہیں ہوتا لیکن متاثر ہونے کا بھی اُس کا ایک اپنا ہی قرینہ ہے۔ پرویز ساحر کی غزل ہر حوالے، ہر اعتبار سے پرویز ساحر کی غزل ہے۔ اُس کی غزل میں لسانی تشکیل کی شعوری کاوشیں، لفظیات، موضوع، آہنگ، بحریں، ردیف، قافیہ، treatment اور عروضی باریکیاں سب کچھ اُس کا اپنا ہے۔ اُس کا ایک اپنا شعری نظام ہے اور اُس کا ہر شعر اس نظام کا نمائندہ۔ اس نوجوانی میں یہ بات اُس کے لیے باعثِ اعزاز ہونی چاہیے۔ وہ صاحب اُسلوب شاعر ہے۔ اُس کا شعر متحیر کرتا ہے

اسی لیے نہیں خود پر مجھے یقیں ہوتا
میں اپنے آپ میں ہوتے ہوئے نہیں ہوتا

اور اُس کی شعری فضا قاری کو خوف زدہ کرتی ہے۔ ساحر کے دو مصرعے دیکھئے:

ع میں اُس کے عشق سے آگے کہیں نکل گیا ہوں
اور ع اب کھلا مجھ پہ کہ اندر سے صدا آئی تھی

پرویز ساحر عشق سے آگے کی راہوں کا مسافر ہے لیکن اپنے اندر کی صدا سے جڑا ہوا ہے۔ یہ دروں بینی اُسے آفاق سے پرے کے سفر میں بھٹکنے نہیں دیتی۔ اُس کا لہجہ تضادات کے امتزاج سے تشکیل ہوا ہے یعنی سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری۔

سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی کی شبنم جب اُس کی قوتِ متخیلہ پر پڑتی ہے تو اُس کا شعر اُن بلندیوں کو چھُوتا ہے جن کی تمنا میں بعض کی تو عمریں کھپ جاتی ہیں۔

اک عمر ہو گئی اسے سہتے ہوئے مگر
''ہونے'' کا یہ عذاب مکمل نہیں ہوا

پرویز ساحر کے اس طرح کے اشعار واقعی خوف زدہ کرتے ہیں۔ اس روانی اور اس سہولت کے ساتھ جب ایسے مشکل مضامین شعر کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو شاعری پر ایمان پختہ تر ہو جاتا ہے۔

تصوف کے ہلکے رنگوں میں پینٹ کیا ہوا عصری منظر نامہ جس کے پس منظر میں کہیں ماضی اور کہیں مستقبل کی ایک دھندلی سی جھلک بھی موجود ہوتی ہے اور جس کے حاشیے کینوس سے باہر کے نامعلوم علاقوں میں بنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے اشعار پرویز ساحر کا اختصاص ہونا چاہئیں اور یہی اُس کا منطقۂ اظہار! میں اُس کی شاعرانہ تعلیموں کو کسی مجذوب کے سخن کی طرح معتبر سمجھتا ہوں جس کے لفظوں میں بعض اوقات پورا گرد و پیش سمٹ آتا ہے۔ ممکن ہے اُس کے اشعار میں کہیں ہم اور آپ بھی بول رہے ہوں لیکن پرویز ساحر کے دیگر شعری سرمائے سے بھی ہمیں صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم شاعری پر نہیں، چند مخصوص اشعار پر تنقید کرتے ہیں اور یہ گمراہ کن رویّہ ہے۔

میرؔ کو ہم نے اُس کے بہتّر نشتروں سے گھائل کیا اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال پر ہونے والا ۹۹.۹ فی صد کام ردّی کی ٹوکری میں پھینکے جانے کے لائق ہے۔ ظاہر ہے اُس میں وہ کام بھی شامل ہے جو خود ڈاکٹر صاحب نے اقبال پر کیا ہے۔ میں پرویز ساحر کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا کہ شعور رونے والے اس شاعر کو ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ یقیناً اُس کی شاعری ابھی مزید نکھرے گی کہ وہ بھرپور امکانات کا شاعر ہے۔

آئن سٹائن نے میرے کان میں کبھی ایک سرگوشی کی تھی کہ جہاں سے تم چیزوں کو دیکھتے ہو یہی معتبر زاویہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عظیم سائنسدان نے کبھی آپ سے بھی کچھ کہا ہو۔ اگر ایسا ہے تو آپ بھی پرویز ساحر کا کوئی شعری مجموعہ اُٹھائیے اور سارے تعصّبات سے بالا ہو کر اس کا مطالعہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کم از کم اتنا تو ضرور کہیں گے کہ پرویز ساحر واقعی ایک منفرد شاعر ہے، انفرادیت سے بڑھ کر ایک سچے فنکار کو اور کیا چاہیے۔

دشت کی بھیگی رات میں ساحرؔ
آؤ ، جگنو تلاش کرتے ہیں

☆☆☆

برٹرینڈ رسل/ ڈاکٹر شگفتہ حسین

ملکہ شیبا کا کابُوسی خواب

شاہ سولومن کو ملنے کے بعد ملکہ شیبا واپسی پر سفید گدھے پر سوار صحرا میں سے گزر رہی تھی، ساتھ میں اس کا وزیر اعظم تھا جو بہت ہی معمولی رنگت کے گدھے پر سوار تھا۔ جس وقت وہ سفر کر رہے تھے تو راستے میں ملکہ باتیں کرتے ہوئے شاہ سولومن کی دولت اور ذہانت کو یاد کر رہی تھی۔

''میں ہمیشہ یہ سوچا کرتی تھی''، اس نے کہا، ''کہ شاہی جاہ وجلال کے اعتبار سے میرا اندازِ حکمرانی بالکل صحیح ہے اور اس سے پہلے مجھے یہ اُمید تھی کہ میں اپنے شاہی خزانوں کا معیار برقرار رکھنے میں کامیاب رہوں گی، لیکن جب میں نے شاہ کی ملکیت اس کے خزانے دیکھے تو میرا حوصلہ جواب دے گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ اس کی ذہانت کے خزانوں کے سامنے اس کے محل کے خزانے ماند ہیں۔ آہ، اے میرے پیارے وزیر، کیسی زیرکی، زندگی کے بارے میں کیسی اعلیٰ معلومات کیسی ذکاوت وذہانت جھلکتی ہے اس کی گفتگو میں!! جتنی سیاسی سوجھ بوجھ شاہ کی ایک چھوٹی سی انگلی میں ہے، اگر اتنی سوجھ بوجھ تمہارے پورے وجود میں ہوتی تو اپنی سلطنت میں ہمیں جتنی مشکلات درپیش ہیں ان میں سے کسی ایک بھی پریشانی کا سامنا نہ ہوتا، لیکن صرف اسی پر بس نہیں ہے کہ دولت اور ذہانت میں کوئی اس کا ثانی نہیں بلکہ وہ ایک نہایت شاندار اور اعلیٰ شاعر بھی ہے (گو شاید صرف مجھے ہی یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ بات صرف میں جانتی ہوں) جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو اس نے مجھے جواہرات سے مزین ایک کتاب دی، یہ اس کی اپنی بے مثال خوبصورت لکھائی میں تحریر کردہ تھی، اور اس میں انتہائی نازک، نفیس اور خوبصورت زبان میں اس حظ وانبساط کا بیان تھا، جس کا تجربہ اُسے میری رفاقت میں ہوا تھا۔ اس میں کچھ تو ایسے بند ہیں جن میں میری کچھ بہت ہی ذاتی، موہ لینے والی اداؤں کے لیے تعریفوں کے پُل باندھے گئے ہیں اور جنہیں تمہیں دکھاتے مجھے شرم آتی ہے، لیکن اس کتاب کے کچھ حصے ایسے ہیں کہ صحرا میں سفر کرتے سمے اپنی شاموں کو بہلانے کے لیے میں شاید تمہیں پڑھ کر سنا سکتی ہوں۔ اس نازک اور نفیس جلد میں نہ صرف ایسے الفاظ ہیں جنہیں کوئی بھی خاتون عاشقانہ لبوں سے سننا چاہے گی، بلکہ تخیلاتی دل سوزی کی روح کے ساتھ اس نے مجھے ایسے شاعرانہ الفاظ سے نسبت دی ہے، جنہیں اپنی زبان سے ادا کرتے مجھے خوشی ہو گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ دوبارہ ایسا مکمل اتصال، ایسی جامع ہم آہنگی اور روح کی گہرائیوں اور خلوت میں اُترتی فہم کی رسائی مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ افسوس مجھ پر عائد میری رعیت کی ذمہ داریاں مجھے مجبور کر رہی ہیں کہ میں واپس اپنی سلطنت کو لوٹ جاؤں، لیکن تادمِ مرگ میں اس بات کو یاد رکھوں گی کہ اس دنیا

میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو میری محبت کا استحقاق رکھتا ہے۔''

''ملکہ عالیہ''، وزیر نے جواب دیا، ''یہ میرے لیے مناسب نہیں کہ میں آپ کے قلب شاہی میں کسی قسم کے شکوک پیدا کرو، لیکن ہم سب جو آپ کے چاکر ہیں، ان کے لیے یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ ہم مردوں کے درمیان کوئی ایسا بھی ہے جو آپ کا ہم سر ہے۔''

اسی لمحے ڈوبتے سورج سے ایک خستہ حال تھکا ماندہ شخص پیدل چلتا نمودار ہوا۔

''یہ کون ہوسکتا ہے؟''، ملکہ نے کہا۔

''کوئی بھکاری، ملکۂ عالیہ''، وزیر اعظم نے کہا، ''اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس کی راہ سے ہٹ کر نکل چلیں۔''

لیکن ملکہ نے محسوس کیا کہ قریب آتے اجنبی کی شکل وصورت، چال ڈھال میں جو وقار ہے وہ اس کے بھکاری تو نہیں البتہ کچھ اور ہونے کی دلیل ضرور ہے۔ چنانچہ وزیر اعظم کے احتجاج کے باوجود اس نے اپنا گدھا اس کی طرف موڑ دیا۔ ''اور تم کون ہو؟'' اس نے کہا۔ اس آدمی کے جواب نے وزیر اعظم کے تمام شکوک رفع کر دیے، کیونکہ وہ بولا تو اس کا لہجہ شیبا کے شاہی دربار سا نستعلیق تھا: اس نے کہا، ''میرا نام بیلزی بب ہے ملکہ عالیہ، لیکن ممکن ہے کہ یہ نام آپ کے لیے اجنبی ہو، کیونکہ میں سرزمین کنعان سے باہر دور پرے کبھی کبھار ہی سفر کرتا ہوں۔ البتہ آپ کون ہیں، میں خوب جانتا ہوں اور نہ صرف یہ کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آ رہی ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کن تصورات نے آپ کی ڈوبتے سورج کی سوچوں میں جوشِ جذبات کی روح پھونکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا خستہ حلیہ میرے لفظوں کو جھٹلا دے، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اس دانش مند سلطان سے مل کر آ رہی ہیں، جو برسوں سے میرا مستقل دوست چلا آ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سب جو اس سے متعلق تھا اور جس کے بارے میں اس کی خواہش تھی کہ آپ کو بھی معلوم ہو، اس نے آپ کو بتا دیا ہوگا، لیکن اگر ___ اگرچہ ایسا سوچنا ہی بڑی جرأت کا کام ہے ___ کوئی ایسی بات جو آپ اس کے بارے میں جاننے کی خواہش رکھتی ہوں اور جو وہ بھی سمجھتا ہو کہ بتائی جا سکتی ہے، آپ صرف مجھ سے پوچھ سکتی ہیں، کیونکہ اس کا کوئی راز مجھ سے پوشیدہ نہیں۔''

''تم مجھے حیران کر رہے ہو''، ملکہ نے کہا، ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ہماری گفتگو بہت طویل ہو گی اور ایسی صورت میں جبکہ تم پیدل چل رہے ہو اور میں سواری کر رہی ہوں تو گفتگو کا یہ مرحلہ آسانی سے طے نہ ہو سکے گا۔ سو میرا وزیر اعظم تمہیں اپنا گدھا سواری کے لیے دے گا اور یوں ہم بآسانی بات چیت کر سکیں گے۔''

ملکہ عالیہ کے حکم کی بادل نخواستہ بجا آوری کرتے وزیر اعظم صاحب اپنے گدھے سے نیچے اُتر آئے اور سواری اجنبی کو پیش کر دی۔

''میرا خیال ہے''، ملکہ نے کہا، ''کہ شاہ سولومن کے ساتھ تمہاری بات چیت ریاستی اور عمیق

حکیمانہ امور پر ہوتی ہوگی۔ میں خود بحیثیت ایک ملکہ کے، دانش مندی کے اعتبار سے کم مشہور نہیں ہوں، میں نے بھی اس کے ساتھ ان اُمور پر گفتگو کی ہے، لیکن ہماری کچھ گفتگو ایسی تھی جس نے ___ یہاں کم از کم میں اپنی تعریف ضرور کروں گی ___ اس کی شخصیت کے ایک پہلو کو واضح کر دیا، میرا خیال ہے، اس کے اس پہلو کے بارے میں میری نسبت تم زیادہ اچھی طرح نہیں جانتے، اور اس کے بہترین حصے کو کسی حد تک اس نے اس کتاب میں جگہ دی ہے جو اس نے مجھے اس وقت دی تھی جب ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو رہے تھے۔ بہت سی خوبصورت چیزیں مثال کے طور پر، بہار کا دلکش بیان اس کتاب میں موجود ہے۔''

''آہ''، بیلزی بب نے کہا، ''اور کیا اس بیانیہ میں وہ کچھوے کی آواز کی بابت بھی کچھ کہتا ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں''، ملکہ نے کہا، ''لیکن تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''اوہ، وہ بس''، بیلزی بب نے جواب دیا''، وہ اس بات پر بہت مغرور ہے کہ اس نے کچھوے کو بہار کے موسم میں بولتے سنا ہے اور جب کبھی بھی اُسے موقع ملتا ہے اُسے اس امر کا اظہار کرنا پسند ہے۔''

''اس کے کچھ ستائشی کلمات نے''، ملکہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''مجھے خاص طور پر بہت محظوظ کیا۔ یروشلم سے یہاں آتے ہوئے، سفر کے دوران میں نے عبرانی زبان کی مشق کی تھی، لیکن مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ میں نے اس پر صحیح طور سے عبور حاصل کر لیا ہے یا نہیں۔ اس لیے مجھے اس وقت بہت خوشی ہوئی جب اس نے کہا، ''آپ کی گفتگو نہایت دلفریب ہے۔''

''یہ واقعی اس کی کرم نوازی ہے''، بیلزی بب نے کہا، ''اور کیا اس لمحے اس نے یہ کلمات بھی کہے کہ ملکہ عالیہ کی کنپٹیاں انار کے ایک ٹکڑے جیسی ہیں؟'' ''اوہ واقعی''، ملکہ نے کہا، ''یہ معاملہ تو پُر اسرار ہوتا جا رہا ہے! اس نے واقعی ایسا ہی کہا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ یہ بڑا عجیب و غریب ستائشی کلمہ ہے، لیکن حیرت انگیز طور پر تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''ملکہ عالیہ''، بیلزی بب نے کہا، ''آپ کو تو پتہ ہے سارے عظیم لوگوں کے دماغ میں انوکھے خیالات آتے رہتے ہیں اور شاہ سولومن بھی اناروں سے غیر معمولی دل چسپی رکھتا ہے۔''

''یہ تو سچ ہے''، ملکہ نے کہا، ''کہ اس کے بعض تقابل اور موازنے نہایت انوکھے اور غیر معمولی ہیں۔ مثال کے طور پر اس نے کہا کہ میری آنکھیں ہیشبون کے مچھلیوں کے تالابوں جیسی ہیں۔''

''میں اُسے جانتا ہوں''، بیلزی بب نے کہا، ''وہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب موازنے کرتا ہے۔ کیا اس نے کبھی ملکۂ عالیہ کے ناک کا مینارِ لبنان سے تقابل کیا؟''

''اوہ خدایا''! ملکہ چلائی، ''حد ہو گئی زیادتی کی بھی! اس نے واقعی یہ موازنہ بھی کیا تھا، لیکن تم مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہو کہ میرے شک سے بھی بالاتر تمہارا کوئی اور بہت قریبی ذریعۂ معلومات ضرور ہے۔''

''ملکہ عالیہ''، بیلزی بب نے جواب دیا، ''مجھے یہ ڈر ہے کہ میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ آپ کے لیے باعثِ اذیت ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی کچھ بیویاں میری دوست ہیں اور ان کے ذریعے مجھے اُسے بہتر طور پر سمجھنے کا موقعہ ملا ہے۔'' ''صحیح! لیکن اس محبت بھری نظم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''وہ! اچھا، آپ یہ دیکھیں، جب وہ نوجوان تھا، اور اس کا باپ ابھی حیات تھا، تو ان دنوں اُسے زیادہ کشٹ اُٹھانا پڑتا تھا۔ ان دنوں وہ ایک کسان کی صالح نیکوکار بیٹی کی محبت میں مبتلا تھا، چنانچہ صرف اپنے شاعرانہ تحفوں ہی کے ذریعے اس نے اس کی جھجک کو دور کیا تھا، بعد ازاں اس نے سوچا کہ یہ تو بڑے ہی دکھ کی بات ہے کہ ایسے نذرانے ضائع ہو جائیں، چنانچہ پھر اس نے ایسا کیا کہ باری آنے پر اپنی محبوب خاتون کو ان نذرانوں کی ایک ایک نقل دے دی۔ آپ جانیں ملکۂ عالیہ! بنیادی طور پر وہ چیزوں کو جمع کرنے کا شائق ہے اور یقیناً جب آپ اس کے محل میں گئی ہوں گی تو آپ نے بھی ضرور محسوس کیا ہو گا۔ ایک طویل ریاضت کے بعد اسے یہ فن آ گیا ہے کہ ان عورتوں میں سے ہر ایک یہی سمجھتی ہے کہ اس کی چاہتوں میں سب سے اہم اور ممتاز وہی ہے، اور آپ، عزیز خاتون، اس کی آخری اور سب سے ممتاز و نمایاں فتح ہیں۔''

''اوہ، بدبختی!'' ملکہ چلائی، ''اب میں کبھی بھی کسی مرد کی فریب کاری سے دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ میں کبھی خوشامد سے اپنی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھنے دوں گی۔ سوچو ذرا کہ میں، جسے میری پوری سلطنت میں سب سے زیادہ زیرک و دانا جانا جاتا ہے، میں نے خود کو اس طرح گمراہ ہونے اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی اجازت دے دی!''

''نہیں پیاری خاتون نہیں''، بیلزی بب نے کہا، ''دل گیر نہ ہوں، کیونکہ شاہ سولومن نہ صرف اپنی تمام اقلیموں میں بلکہ تمام مردوں میں دانا و زیرک ہے اور صدیوں تک اس کی شہرت یہی رہے گی۔ اس جیسے شخص سے دھوکا کھانا ایسی شرمندگی کی بات نہیں ہے۔''

''شاید تم صحیح کہتے ہو''، اس نے کہا، ''لیکن میرے پندار کو جو ٹھیس لگی ہے اسے ٹھیک ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔''

''آہ اے خوش ادا ملکہ''، بیلزی بب نے جواب دیا، ''یہ امر میرے لیے باعثِ مسرت ہوتا کہ کاش میں وقت کے مرہم رکھنے کے عمل کو تیز کر سکتا! خدا مجھ سے اس فریبی مطلق العنان فرماں روا کی حیلہ گری کے اتباع کو دُور رکھے، میری ذات سے صرف وہ سادہ الفاظ رواں ہوں گے، جو میرے دل کے بے ساختہ جذبات کے ہدایت یافتہ ہیں۔ اے ملکہ عالیہ ___ آپ کہ ___ بے نظیر ہیں ___ عدیم المثال ہیں ___ اہلِ جنوب کا لاثانی ہیرا ہیں ___ اگر آپ اجازت دیں تو ___ ایک سچی تعریف جس کی آپ سزاوار ہیں ___ میں اس سچی تعریف کا مرہم آپ کی نذر کرنا چاہوں گا۔''

''تمہارے الفاظ تسکین بخش ہیں''، اس نے جواب دیا، ''لیکن کیا تم اس کی شان و شوکت کی ہمسری کر سکتے ہو؟ کیا تمہارے پاس ایسا محل ہے جس سے تم اس کے محل کا مقابلہ کر سکو؟ کیا تمہارے پاس اس جیسا قیمتی جواہرات کا خزانہ ہے؟ ایسی شاہی خلعتیں ہیں جو مر اور لوبان کی مسحور کن خوشبوئیں لٹاتی ہوں؟ اور ان سب سے زیادہ اہم ایک چیز ___ کیا تمہارے پاس اس جیسی زیرکی و دانائی ہے؟''

''حسین و دلکش شیبا''، اس نے جواب دیا، ''میں ہر نکتے پر آپ کو مطمئن کر سکتا ہوں، میرے پاس شاہ سولومن سے کہیں زیادہ عالی شان اور پر شکوہ محل ہے۔ میرے پاس کہیں زیادہ قیمتی جواہرات کا خزانہ ہے۔ میری شاہی خلعتیں اتنی بے شمار ہیں جتنے آسمان پر دمکتے تارے اور رہی بات زیرکی و دانائی کی، تو یہاں وہ میرے مقابل نہیں ٹھہر سکتا۔ شاہ سولومن اس امر پر حیرت زدہ ہے کہ، اگرچہ دریا سمندر میں گرتے ہیں، لیکن پھر بھی ابھی تک سمندر پورا نہیں بھرا۔ جبکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ سردیوں کی کسی طویل حسین شام کو ملکۂ عالیہ کی خدمت میں البتہ عرض کروں گا۔ شاہ کی ایک زیادہ سنجیدہ غلطی کے بارے میں آپ کو بتاؤں اور وہ یہ تھی کہ جب اس نے آپ کو دیکھا تھا تو کہا تھا کہ ''اس جلتے سورج کے نیچے کوئی بھی چیز نئی اور انوکھی نہیں ہے۔'' کیا آپ گمان کر سکتی ہیں کہ وہ اس وقت آپ کی حق تلفی کرتے ہوئے آپ کا موازنہ اپنی نوجوانی کی محبوبہ اس کسان کی بیٹی کے ساتھ کر رہا تھا؟ اور کیا کسی ایسے آدمی کو عقل مند کہا جا سکتا ہے، جس نے آپ کو دیکھا ہو اور پھر اس نے فوری یہ نتیجہ اخذ نہ کیا ہو کہ یہ ہے عجوبۂ روزگار خوبصورتی اور شان و شکوہ کا مرقع ___!؟ نہیں ___! دانائی کے مقابلے میں، میں اس سے کسی طور ہیٹا نہیں۔''

ایک مسکراہٹ کے ساتھ، جو کچھ ماضی سے دست برداری اور کچھ آئندہ آنے والے پُر مسرت مستقبل کی طلوع ہوتی اُمید کو لیے ہوئی تھی، اس نے اپنی آنکھیں بیلزی بب کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا، ''تمہارے الفاظ بہلاوا دیتے، گمراہ کن ہیں۔ میں نے اپنی سلطنت سے شاہ سولومن سے ملنے کے لیے ایک طویل سفر اختیار کیا اور میرا خیال تھا کہ اس کائنات میں جو بھی سب سے زیادہ قابلِ ذکر تھا میں نے دیکھ لیا، لیکن اگر تم سچ بول رہے ہو تو تمہاری سلطنت تمہارا محل اور تمہاری دانائی سب شاہ سولومن سے بڑھ کر ہے۔ کیا میں تمہاری سلطنت کا دورہ کر کے اپنے سفر کو مزید وسعت دے سکتی ہوں؟''

اس نے مسکراہٹ کا جواب ایسی مسکراہٹ سے دیا جس میں پیار کا اظہار بمشکل جیت جانے کی حقیقت کو چھپا پا رہا تھا، ''میں اس سے زیادہ خوشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا''، اس نے کہا، ''کہ آپ مجھے اس امر کی اجازت دیں کہ میں اپنا حقیر مال و زر آپ کے قدموں میں ڈھیر کر سکوں، لیکن راستہ تاریک اور مشکل ہے، اور خونخوار، تُند خور ہزنوں سے اَٹا پڑا ہے۔ اگر آپ محفوظ رہنا چاہتی ہیں تو پھر آپ کو مکمل طور پر میری رہبری پر بھروسہ کرنا ہوگا۔''

''میں ایسا ہی کروں گی''، اس نے کہا، ''تم نے مجھے نئی اُمید دلائی ہے۔''

اسی لمحے وہ پہاڑوں میں واقع ایک طویل بے کنار غار میں پہنچے۔ ہاتھ میں جلتی مشعل اونچی اُٹھائے، بیلزی بب لمبی سرنگوں اور پیچ دار و خم دار راستوں میں سے ہوتا آگے آگے چلتا رہنمائی کر رہا تھا، آخر کار وہ ایک وسیع و کشادہ ہال میں داخل ہوئے۔ جو بے شمار قندیلوں سے روشن تھا۔ دیواریں اور چھت قیمتی پتھروں سے مزین جگمگ جگمگ کر رہی تھیں اور ان کے زرفشاں پہلو قندیلوں کی روشنی منعکس کر رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک تین سونقرئی تخت باوقار انداز سے سجے تھے۔

''بلاشبہ یہ سب بہت شاندار ہے'' ملکہ نے سراہتے ہوئے کہا۔

''اوہ''، بیلزی بب نے کہا، ''یہ میرا دوسرے درجے کے حاضرین کا دربار ہے۔''

پھر اس نے ایک ایسا دروازہ کھولا جو ابھی تک غیر مرئی تھا اور اسے لیے ایک دوسرے ہال میں آیا، جو پہلے سے دوگنا زیادہ کشادہ تھا، دوگنا زیادہ شاندار طریقے سے روشن کیا گیا تھا، اور جس کی تزئین دوگنا زیادہ ہیرے جواہرات سے کی گئی تھی۔ اس کی تین دیواروں کے ساتھ سات سو سنہری تخت سجے تھے۔ چوتھی دیوار کے ساتھ دو تخت دھرے تھے۔ دونوں تخت قیمتی پتھروں، ہیروں، نیلم، یاقوت اور بڑے بڑے موتیوں سے سجائے گئے تھے۔ یہ سب معلوم نہیں کیسی عجیب و غریب فن کاری کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے کہ ملکہ کے لیے اس فن کو سمجھنا دُشوار تھا۔

''یہ'' اس نے کہا، ''میرا سب سے بڑا دربار ہے، اور رہے ہیرے جواہرات جڑے دونوں تخت، تو ان میں سے ایک میرا ہے اور دوسرا آپ کا ہوگا۔''

''لیکن'' اس نے کہا، ''ان سات سو سنہری تختوں پر کون بیٹھے گا؟''

''اوہ اچھا!'' اس نے کہا''، یہ آپ کو ابھی پتہ چل جائے گا۔''

جوں ہی اس نے یہ کہا، وہیں مہارانیوں جیسی ایک شاندار ہستی جو ملکہ شیبا سے بس ذرا سی ہی کچھ کم شاندار تھی، سبک رفتاری سے چلتی اندر آئی اور پہلے سنہرے تخت پر براجمان ہوگئی۔ تقریباً ایک دھچکے کی سی کیفیت کے ساتھ ملکہ شیبا نے اسے پہچان لیا کہ وہ شاہ سولومن کی ملکہ اوّل تھی۔

''مجھے اس سے یہاں ملنے کی قطعی توقع نہ تھی''، اس نے قدرے لرزتی آواز میں کہا، ''آہ واقعی!'' بیلزی بب نے کہا، ''آپ نے دیکھا میرے پاس جادوئی طاقتیں ہیں اور جس وقت میں آپ سے اظہارِ عشق کر رہا تھا، عین اس وقت میں اس خوبصورت اچھی خاتون کو بھی بتا رہا تھا کہ شاہ سولومن جو دکھائی دیتا ہے وہ سب سچ نہیں ہے۔ اس نے میری باتوں کو ویسے ہی دھیان سے سنا جیسے آپ نے ___ اور اس لیے یہ یہاں آ گئی ہے۔''

ابھی اس نے بمشکل اپنی بات ختم کی ہوگی کہ ایک اور معزز خاتون جسے ملکہ شیبا نے پہچان لیا کہ شاہ سولومن کے حرم کے دورے کے دوران اس نے اُسے وہاں دیکھا تھا، اندر داخل ہوئی اور دوسرے سنہری تخت پر براجمان ہوگئی۔ پھر تیسری آئی، پھر چوتھی، پانچویں، حتیٰ کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ

جلوس کبھی ختم نہ ہوگا۔ آخر کار تمام کے تمام سات سو سنہری تختوں پر خوبصورت عورتیں سج گئیں۔ ''آپ یقیناً''، بیلزی بب نے پرچانے والے لہجے میں کہا، ''دیگر تین سو نقرئی تختوں کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہو رہی ہوں گی۔ اس وقت ان تمام پر شاہ سولومن کی تین سو لونڈیاں براجمان ہیں۔ اس دربار اور دوسرے دربار میں موجود ان ایک ہزار خواتین نے مجھ سے وہی باتیں سنی ہیں جو آپ نے آج سنیں اور سب میری باتوں پر ایمان لائیں، مجھ پر یقین کیا اور یوں یہ سب اس وقت یہاں موجود ہیں۔''

''دھوکے باز، فریبی''، ملکہ چلائی، ''میں اتنی سادہ کیوں ہوں کہ میں نے دوسری بار پھر دھوکا کھایا! بس آئندہ سے میں تنہا حکومت کروں گی اور کسی مرد کو یہ موقع نہیں دوں گی کہ وہ مجھے دھوکا دے سکے۔ الوداع اے بدنفس انسان، الوداع! اگر کبھی تم نے میری سلطنت میں داخل ہونے کی جرأت کی تو تمہیں اپنے مقدر کی لکھی وہ ذلت برداشت کرنا پڑے گی، جس کی سزاوار تمہاری یہ مکاری ہے۔''

''ناں، ناں اچھی خاتون! بیلزی بب نے کہا، ''مجھے یہ ڈر ہے کہ آپ صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھ نہیں رہی ہیں۔ میں نے آپ کو اندر آنے کا راستہ دکھایا ہے اور رہا یہاں سے باہر جانے کا راستہ تو وہ صرف میں ہی تلاش کر سکتا ہوں۔ یہ مردوں کا مسکن ہے، اور آپ یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنے کے لیے آئی ہیں___ البتہ ہیرے جواہرات جڑے تخت پر آپ میرے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ نہیں بیٹھ سکیں گی۔ اس تخت پر آپ صرف اس وقت تک بیٹھیں گی جب تک ایک اور ملکوتی حسن کی مالک ملکہ، یعنی مصر کی آخری ملکہ، آپ کی جگہ لینے کے لیے نہیں آ جاتی۔''

ان الفاظ نے ملکہ شیبا کے دل میں مایوسی اور غصے کے ایسے شدید اور پُر جوش جذبات پیدا کیے کہ وہ ایک دم سے بیدار ہو گئی۔

''میرا خیال ہے''، وزیرِ اعظم نے کہا، ''ملکہ عالیہ نے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہے۔''

☆☆☆

امرجلیل/ننگرچنا

ہولی

(سندھی سے ترجمہ)

وہ ہمیشہ کی طرح بھاگتا ہوا آیا۔ کتابوں کا بستہ کھونٹی میں لٹکا کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی پانچ برس ہوگی لیکن شوخی اس کے رگ و پے میں بجلی کی طرح دوڑتی پھرتی ہے۔ وہ میرا سب سے چھوٹا بھتیجا ہے۔ میں اسے بے حد عزیز رکھتا ہوں۔ وہ ہے بھی بہت سندر، کسی چینی کی مٹی کے گڈے کی طرح۔ بھابھی اسے اکثر رنگین نکریں اور شرٹیں پہناتی ہے وہ اور بھی پیارا ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے بے حد عزیز ہے اس لیے میں اسے 'ہولی' کے نام سے پکارتا ہوں۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی دوڑتا ہوا آیا، بستے کو کھونٹی میں لٹکایا اور باورچی خانہ میں گیا۔ دوپہر کا کھانا اُٹھا کر لے آیا اور میز پہ رکھا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی۔ وہ ہاتھ دھونا بھی بھول گیا تھا۔ اُس نے کرسی لا کر میز سے لگائی اور کھانا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے آواز دی

''ہولی___!''

''جی چچا___!''

''بیٹے! ہاتھ نہیں دھوؤ گے؟''

''دھوتا ہوں چچا!'' اُس نے ہاتھ میں اُٹھایا ہوا لقمہ بھی رکھ دیا۔ شینک کا نل کھول کر صابن سے خوب اچھی طرح ہاتھ دھو کر لوٹ آیا۔ جتنا میں اسے چاہتا ہوں وہ بھی مجھے اتنا ہی پسند کرتا ہے۔ اس نے ایک لقمہ ہی اُٹھایا تھا کہ اسے کچھ یاد آیا۔

''چچا___!''

''جی بیٹا!''

''چچا! آپ مجھے 'ہولی' کیوں کہتے ہیں؟''

''اس لیے کہ تم مجھے بہت پیارے ہو۔''

لیکن اُس کا تجسس ختم نہیں ہوا۔ دو چار لقمے نگل کر منہ میری طرف کیا اور کہا

''آج ہماری نئی ٹیچر نے پوچھا کہ سب تمہیں 'ہولی' کیوں کہتے ہیں؟''

''تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا کہ میرے چچا نے میرا نام ہولی رکھا ہے۔''

وہ پانی کے دو تین گھونٹ لے کر شوخی بھرے لہجے میں بولا ''چچا! پتہ ہے ٹیچر نے ہولی کے معنی

کیا بتائے؟''

میں نے سوچا، بھلا ایک کرستان لیڈی نے چھوٹے ہولی کو 'ہولی' کے معنی کیا بتائے ہوں گے۔ وہ بیچاری تو رنگین پانی سے کھیلی ہی نہیں، اسے ہولی کا کیا پتہ؟ لیکن میں نے ہولی سے پوچھا۔

''ٹیچر نے کیا بتایا؟''

''ٹیچر نے کہا، ہولی کے معنی ہیں پاک۔'' ہولی نے اپنا ننھا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

میں نے سوچا کہ ٹیچر نے سچ ہی تو بتایا ہے۔ چاہت اور محبت کے ساتھ ایک دوسرے پر پھینکا گیا پانی، پاک ہی تو ہوتا ہے لیکن میں جس جذبے کے تحت اسے ہولی پکارتا ہوں اسے یہ معصوم بچہ کس طرح سمجھ پائے گا؟ میں نے تو اسے کسی کی یاد سے وابستہ کر دیا ہے۔

''ہولی معنی پاک، پوتر پانی۔'' میں نے کہا۔

وہ جھنجھلا گیا۔ اُس کے چھوٹے سے دماغ کے لیے یہ باتیں بے معنی تھیں۔ پھر بھی اُس نے پوچھ لیا۔

''بھلا یہ پانی کیسا ہوتا ہے؟''

''رنگ برنگی ___ دھنگ رنگوں ایسا۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''پچکاریوں میں بھر کر ایک دوسرے کو پیار سے بھگونے کا نام ہے 'ہولی'، رنگین پانی کے کھیل کا نام ہے 'ہولی' ___''

''کس رنگ کا ہوتا ہے یہ پانی؟'' اُس نے اپنا بایاں گال ہتھیلی پر ٹیکتے ہوئے کہا۔

''لال، گلابی، نیلا، سبز ___ اور ___'' نہ جانے کیسے میری آواز بھرا گئی۔

''بھلا کون کھیلتے ہیں یہ کھیل؟''

''کھیلتے تھے ___ ہولی! کھیلتے تھے ___!!'' میں نے دل کے درد کو آنکھوں میں چھپاتے ہوئے کہا۔

''پرکاش، موہن، پرشوتم ___ اور اندرا ___'' میری پلکیں بھیگ گئیں۔ پرانے زخم تازہ ہونے لگے۔ ناسُور کس طرح ختم ہوسکتا ہے! ہولی بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ رنگین پانی کی کہانی سن رہا تھا۔ میں نے بتانا شروع کیا۔

''سادھ بیلے سے شیش محل تک، سندھو دریا بھی رنگین ہوجاتا تھا۔ ڈھورو، ناری شالہ، چبوترہ، ڈھک بازار سب کے سب قوس وقزح سے زیادہ حسین رنگوں میں رنگ جاتے تھے۔''

ہولی اپنی کہانی سن رہا تھا۔

''___ اور ہولی! اندرا ہمارے گھر آکر ابو، امی، بھائی اور مجھے پچکاری سے رنگ دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ آسمانی رنگ ڈالتی تھی ___ ایسا سوہنا رنگ، ہولی!''

آنسو پلکوں کی رکاوٹ توڑ کر مَن کی آگ بجھانے آئے۔ میں نے ہولی سے نظریں بچا کر،

آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ ہولی کرسی سے چھلانگ مار کر اُٹھا اور میری طرف آیا۔ اپنے نازک بازو میرے گلے میں ڈال دیئے اور گلے لگاتے ہوئے کہنے لگا

''چچا! ہم بھی رنگین پانی کا کھیل کھیلیں گے۔''

میرے گھاؤ اور بھی گہرے ہوگئے۔ میں نے سسکیاں روکتے ہوئے کہا۔

''ہمارے پاس وہ پانی نہیں ہے، ہولی! ہمارے پاس وہ پانی نہیں ہے۔''

ہولی کا چہرہ اُتر گیا اور میں نے اسے اپنے گھائل سینے سے لگا دیا۔

☆☆☆

الفریڈ جیلینک (Elfriede Jelinek)

۲۰۰۴ء کے ادب کا نوبیل انعام آسٹریا سے تعلق رکھنے والی خاتون ناول نگار، شاعرہ اور فلم اور ڈرامہ نویس محترمہ الفریڈ جیلینک (Elfriede Jelinek) کو ملا ہے۔ الفریڈ جیلینک ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو آسٹریا کے شہر مرزسچلیگ (Murzzuschlag) میں پیدا ہوئیں۔ اسی شہر سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ویانا سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے ویانا یونیورسٹی سے تھیٹر اور آرٹ ہسٹری کی تعلیم حاصل کی۔

نوجوان ہی تھیں کہ شاعری کا آغاز کیا اور پھر ان کا مجموعہ کلام لیساس شیٹن (Lisas Schattan) کے نام سے ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا۔ ۱۹۷۰ء میں ان کا مزاحیہ ناول "Wir Sind Lockvogel Baby" کے نام سے شائع ہوا۔ پھر انہوں نے جرمن زبان میں بننے والی فلموں اور ڈراموں کے لیے بھی لکھا۔ ان کے ناولوں کو جرمن زبان سے فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ جن ناولوں کو انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا ان میں ذیل کے ناول شامل ہیں۔

''دا پیانو ٹیچر'' (The Piano Teacher)

''ونڈرفُل، ونڈرفُل ٹائمز'' (Wonderful, Wonderful Times)

''لَسٹ'' (Lust)

''وومن ایز لوورز'' (Women as Lovers)

اس کے علاوہ جرمن زبان میں ان کے بے شمار ناول ہیں۔ ادب کا نوبیل انعام حاصل کرنے سے پہلے انہیں آسٹریا کے تقریباً ۲۰ اعلیٰ ادبی انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔

جورنسٹرن جورنسن/ نیر عباس زیدی

بھاگوان

وہ شخص جس کی کہانی یہاں بیان کی جا رہی ہے، اپنے حلقے کا سب سے رئیس اور صاحبِ ثروت کسان تھا اور اس کا نام تھورڈ اوورلیس تھا۔ وہ سنجیدہ اور طویل القامت شخص ایک دن پادری کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔'' وہ بولا ''اور میں اسے بپتسمے کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کا نام کیا رکھا ہے؟''

''فِن ___ میرے باپ کے نام پر۔''

''اور اس کے پیش کاروں کے نام؟''

ان کا حوالہ دیا گیا اور اس حلقے میں رہنے والے تھورڈ کے رشتہ داروں میں، وہ لوگ سب سے معزز تھے۔

''کیا کوئی اور بات کرنی ہے؟'' پادری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کسان ذرا جھجکا اور پھر بولا ''مجھے انتہائی خوشی ہوگی اگر میں اپنے بیٹے کو خود بپتسمہ دوں۔''

''تو پھر یہ اس ہفتے کے آخر ہی میں نہ کر لیں۔''

''اگلے سنیچر، دن کے بارے بجے۔''

''کچھ اور بھی کہنا ہے؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔'' اس کسان نے اپنی ٹوپی گھمائی جیسے وہ جانا چاہتا ہو۔

پادری کھڑا ہوا ''تاہم ایک بات ہے'' اور تھورڈ کی طرف بڑھا، اس کا ہاتھ تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ''جو بچہ تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے، یہ تمہارے لیے بھاگوان ثابت ہوگا۔''

افسانہ نگار کا مختصر تعارف

ناروے کے جدید ادب میں جورنسٹرن جورنسن (Bjornsterne Bjornson) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ۱۸۳۲ء میں ناروے کے شمالی پہاڑی علاقے میں پیدا ہوا۔ یونیورسٹی آف کرسٹیانا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور جلد ہی ایک بہترین ڈرامہ نگار، تنقید نگار، شاعر، ناول نگار اور سیاست دان کی حیثیتوں سے شہرت پائی۔ وہ دنیا کا تیسرا شخص تھا جسے ۱۹۰۳ء میں ادب کے نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ جونسٹرن نے اپنے قاری کے لیے ناروے کے دہقان کی زندگی کا عکس پیش کیا ہے جسے وہ اپنی قوم کا حقیقی نمائندہ سمجھتا ہے۔ اُس کا اُسلوب سادہ ہے اور اس کے افسانے فطرت کی سادگی کو بیان کرتے ہیں اور اس اصول پسند زندگی کے امین ہیں جس پر اس کی دھرتی کا دہقان کاربند ہے۔ جونسٹرن چند الفاظ ہی میں شدتِ جذبات کو پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہے اور اس کا یہ افسانہ بھی اس کے اس خاص وصف کو ظاہر کرتا ہے۔

سولہ سال گزرنے کے بعد تھورڈ ایک دن پھر اُسی پادری کے کمرے میں کھڑا تھا۔

''تھورڈ! تم حیران کن حد تک اس عمر میں، اچھی صحت کے مالک ہو۔'' اس پادری نے کہا کیونکہ اسے تھورڈ کے اندر کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے مسائل کا سامنا نہیں۔'' تھورڈ نے جواب دیا۔

اس پر پادری کچھ نہ بولا اور تھورڈ سے پوچھا ''آج کیا خوش خبری ہے؟''

''میں آج اس لیے آیا ہوں کہ کل میرے بیٹے کی چرچ سے کنفرمیشن☆ ہے۔''

''یہ ایک خوش قسمت نوجوان ہے۔''

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کل چرچ میں (کنفرمیشن کی رسم کے لیے) میرے بیٹے کا کون سا نمبر ہوگا۔''

''اس کا نمبر پہلا ہی ہوگا۔''

''شکریہ! یہ رہے آپ کے لیے دس ڈالر۔''

''کیا میں آپ کی کوئی اور خدمت کر سکتا ہوں۔'' پادری نے اپنی نگاہیں تھورڈ پر جماتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اور کچھ نہیں۔'' تھورڈ رخصت ہو گیا۔

مزید آٹھ سال بیت گئے اور ایک دن پادری کے کمرے کے باہر شور سنائی دیا، بہت سے لوگ اس کمرے کی طرف آ رہے تھے، تھورڈ پیش پیش تھا، وہ سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا۔

پادری نے اوپر دیکھا اور اسے پہچان لیا، ''آج تم خاصے لوگوں کو اپنے ساتھ لائے ہو۔'' پادری بولا۔

''میں آج یہاں اس لیے آیا ہوں کہ میرے بیٹے کی مجوزہ شادی کا اعلان کر دیا جائے۔ وہ کیرن سٹورلنڈن نامی لڑکی سے شادی کر رہا ہے اور لڑکی کا والد مسٹر گڈ منڈ بھی میرے ساتھ ہے۔''

''اوہ! یہ تو ہمارے حلقے کی سب سے مالدار لڑکی ہے۔''

''جی! ایسا ہی ہے۔'' کسان نے اپنے ہاتھ سے اپنے بال درست کرتے ہوئے کہا۔

وہ پادری کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں گم ہو گیا، پھر اس نے رجسٹر میں نام درج کیے اور لوگوں نے نیچے دستخط کر دیئے۔ تھورڈ نے پادری کی میز پر تین ڈالر رکھ دیئے۔

''صرف ایک ڈالر ہی کافی ہے۔'' پادری بولا۔

''مجھے معلوم ہے لیکن یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور میں یہ کام خوش اُسلوبی سے کرنا چاہتا ہوں۔''

پادری نے وہ رقم اُٹھالی۔

☆ بپتسمہ دیئے ہوئے شخص کو عیسائی مذہب کا مصدقہ رکن بنانے کی رسم، خصوصاً بالغ ہونے پر۔

''یہ تیسرا موقعہ ہے تھورڈ! جب تم اپنے بیٹے کے معاملے میں یہاں آئے ہو۔''

''لیکن اب میں اپنے بیٹے کی طرف سے بے فکر ہو گیا ہوں۔'' تھورڈ نے کہا اور اپنی چھوٹی ڈائری بند کرتے ہوئے پادری سے رخصت ہوا۔ تمام لوگ اس کے ساتھ باہر چلے گئے۔

دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ ایک دن، انتہائی خوشگوار موسم میں، وہ باپ بیٹا، شادی کی تیاریوں کی غرض سے، سٹور لنڈن کے گھر کشتی میں بیٹھ کر جھیل کے اُس پار جا رہے تھے۔

بیٹے نے کشتی کھیتے ہوئے اچانک کہا ''جس سیٹ پر میں بیٹھا ہوں وہ غیر محفوظ لگ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اپنی سیٹ درست کرنے لگا۔

اسی لمحے وہ تختہ جس پر وہ کھڑا تھا، ٹوٹ گیا اور وہ پانی میں گر گیا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں مارتا رہا اور چلّا تا رہا۔

''اس چپو کو پکڑ لو۔'' باپ نے چپو اس کی طرف کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

انتہائی کوشش کرنے کے بعد بیٹے کا جسم اکڑ گیا۔

''ذرا ٹھہرو!'' اس کا باپ دوبارہ چیخا اور اپنے بیٹے کی سمت کشتی کھینچنی شروع کر دی۔ بیٹے کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے، اس نے اپنے باپ کے چہرے پر ایک آخری نظر ڈالی، اور وہ ڈوب گیا۔

تھورڈ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے کشتی روک لی اور اس جگہ نظریں جما دیں جہاں اس کا بیٹا ڈوبا تھا جیسے اسے دوبارہ سطحِ آب پر واپس آنا چاہیے۔ اس جگہ کچھ بلبلے اُٹھے، ذرا سی دیر بعد کچھ اور، آخر میں ایک بڑا بلبلہ کہ کوئی چیز اندر پھٹی ہو۔ اس کے بعد جھیل کی سطح شیشے کی مثل ہموار اور چمکدار ہو گئی۔

لوگوں نے دیکھا کہ تھورڈ مسلسل تین دن اور تین راتیں بغیر سوئے اور بغیر کھائے پیئے اسی جگہ کشتی گھماتا رہا جہاں اس کا بیٹا ڈوبا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی لاش کے لیے جھیل کو چھان مارنا چاہتا تھا۔ تیسرے دن علی الصبح اسے اپنے بیٹے کی لاش مل گئی۔ اس نے وہ لاش اپنے ہاتھوں میں اُٹھائی اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اس سانحے کو ایک سال بیت گیا۔ خزاں کی ایک رات، اسی پادری نے اپنے کمرے کے باہر ایک آواز سنی، کوئی شخص دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پادری اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ ایک دراز قد، دبلا پتلا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور بال سفید تھے۔ پادری نے اسے غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ وہ تھورڈ تھا۔

''تم اتنی رات گئے یہاں؟'' پادری نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

''ہاں! بہت دیر ہو گئی۔'' تھورڈ نے جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

پادری بھی بیٹھ گیا اور اس کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ تھورڈ کا منتظر ہو۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر تھورڈ نے کہا ''میرے پاس کچھ رقم ہے جو میں غریبوں کے لیے مختص کرنا چاہتا ہوں اور

اس کارِ خیر کو اپنے بیٹے کے نام سے منسوب کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ کھڑا ہوا، میز پر رقم رکھی اور بیٹھ گیا۔ پادری نے اس رقم کو گنا۔

''یہ تو ایک خطیر رقم ہے۔'' پادری بولا۔

''آج میں نے اپنی جائیداد بیچ ڈالی یہ رقم اس کی مالیت کا نصف حصہ ہے۔''

پادری خاصی دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر نہایت شستہ لہجے میں پوچھا ''تھورڈ! اب تم نے کیا کرنے کا ارادہ کیا ہے؟''

''کوئی بھی بہتر کام۔''

وہ دونوں دوبارہ خاموش ہو گئے۔ تھورڈ نظریں جھکائے بیٹھا رہا اور پادری کی نگاہیں تھورڈ پر جمی رہیں۔ پادری بڑے نرم اور شگفتہ انداز میں بولا ''میں نہ کہتا تھا تمہارا بیٹا بھاگوان ہے، آخر وہ تمہارے لیے ابدی خوش قسمتی کا باعث بنا۔''

''ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔'' تھورڈ نے نگاہیں اوپر کرتے ہوئے کہا اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

☆☆☆

صابر ظفر

ایسی تو زمیں یہاں نہیں ہے
جس پر کوئی آسماں نہیں ہے

بجھنا ہو اگر تو پھر ہوا سے
بہتر کوئی شمع داں نہیں ہے

میں اپنے لہو میں بولتا ہوں
میرا کوئی ترجماں نہیں ہے

یا مجھ کو خموشی آ گئی راس
یا بات کوئی گراں نہیں ہے

جو کچھ ہے ترے ظہور سے ہے
کچھ بھی یہاں رایگاں نہیں ہے

تُو سب کا راز داں ہے لیکن
تیرا کوئی راز داں نہیں ہے

جس میں کوئی دخل ہو نہ تیرا
ایسا تو کوئی سماں نہیں ہے

میں نے ترے عشق سے یہ جانا
مجھ سا کوئی شادماں نہیں ہے

سب سلسلے ختم ہو رہے ہیں
اِک تجھ سے دُور جاں نہیں ہے

جی پاؤں ترے بِنا جہاں میں
ایسا تو کوئی جہاں نہیں ہے

محفل تو جمی ہوئی ہے لیکن
تُو شاملِ دوستاں نہیں ہے

پڑھتا ہوں میں آپ نوحہ اپنا
میرا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے

ہر کوئی ہے بے مُہار ایسے
جیسے کوئی سارباں نہیں ہے

ہر پھول بکھرتا جا رہا ہے
جیسے کوئی باغباں نہیں ہے

رنجیری خاموش ہو چکے ہیں
باقی کوئی داستاں نہیں ہے

ہم شہر سے دور آ چکے ہیں
اب شام دھواں دھواں نہیں ہے

بازاری ہے سلوکِ دنیا
اب حرمتِ عاشقاں نہیں ہے

کرتے ہیں پڑے اب اللہ اللہ
اب صحبتِ مہوشاں نہیں ہے

کافی ہے پھسلنا اور گرنا
پاتال کا نردباں نہیں ہے

کس آس پہ میکدے سے نکلیں
اپنا تو کوئی مکاں نہیں ہے

تُو میرے قریب آ رہے گا
ایسا تو کوئی گماں نہیں ہے

میں اُس کو غمِ حسینؑ سمجھوں
وہ جو غمِ دشمناں نہیں ہے

کس رنگ میں تُو نہیں ہے ظاہر
کس چشم پہ تُو عیاں نہیں ہے

عالم پہ محیط حسن تیرا
عالم میں تُو کہاں نہیں ہے

گہرا ہے حجاب تیرا جیسے
ایسا تو کوئی نہاں نہیں ہے

جو تیرے نور سے ہو خالی
ایسی تو کوئی کہکشاں نہیں ہے

تُو ہی تُو ہے عدم کا مالک
اِس واسطے مجھ میں جاں نہیں ہے

ہے تجھ سے ہر ایک گفتگو پُر
ہر چند تیرا بیاں نہیں ہے

جو تیری طرف نہیں بلاتی
اپنی تو وہ اذاں نہیں ہے

نکلے ترا فائدہ نہ جس میں
ایسا تو کوئی زیاں نہیں ہے

گن گاتا ہے اک جہاں تیرا
تُو مجھ پہ ہی مہرباں نہیں ہے

جس سے ہو نہاں تری نشانی
ایسا تو کوئی نشاں نہیں ہے

جو تیری بہار سے نہ مہکے
ایسا کوئی گلستاں نہیں ہے

موجود یہاں ہے میرا مولا
یہ محفلِ بے کساں نہیں ہے

فردوسِ بریں کا منتظر ہوں
یہ آخری خاک داں نہیں ہے

جب تک تجھے جان میں نہ دے دوں
ہستی مری جاوداں نہیں ہے

آ پاس مرے کہ اب کوئی بھی
تیرے مرے درمیاں نہیں ہے

کیوں پیٹ پہ باندھتا ہوں پتھر
کیا تُو روزی رساں نہیں ہے

تُو چاہے سمجھنا اور نہ سمجھے
ایسی تو کوئی زباں نہیں ہے

تیری پلکوں کا ہو جو ہمسر
ایسا تو کوئی سایباں نہیں ہے

دیوار و در نہیں ہوں جس کے
ایسا تو کوئی مکاں نہیں ہے

ویران پڑا نہ ہو جو تجھ بن
ایسا کوئی آستاں نہیں ہے

پھول آتشِ گل سے پڑ رہے ہوں
ایسا تو کوئی آشیاں نہیں ہے

میں جس کے واسطے ہوں زندہ
سانسوں میں ابھی رواں نہیں ہے

دایم جو رہے کسی چمن میں
ایسی تو کوئی خزاں نہیں ہے

جو قیس سے جا ملے سرِ نجد
اب ایسا کوئی جواں نہیں ہے

کیسے ہو کوئی معاملہ طے
تیری جانب سے ہاں نہیں ہے

غافل تو نہیں ہوں میں ہدف سے
ہاتھوں میں اگر کماں نہیں ہے

میں ساتھ اس کے تڑپ رہا ہوں
جو سانس رواں دواں نہیں ہے

بے سود گزر رہا ہے جیون
میرا کوئی جاں ستاں نہیں ہے

میں جاں سے گزر کے دیکھتا ہوں
مجھ سا کوئی جاں فشاں نہیں ہے

واقف نہ ہو جو ہوا کے دکھ سے
ایسا کوئی بادباں نہیں ہے

لگتا ہے کہ سو چکے اسیران
زنداں میں کوئی فغاں نہیں ہے

میں دیکھ لوں آنکھ بھر کے اُس کو
یہ بھی تاب و تواں نہیں ہے

جب لٹ چکے ہم تو پھر یہ جانا
اب کوئی پاسباں نہیں ہے

اک زہر گھلا ہے دونوں جانب
دونوں جانب سے ہاں نہیں ہے

آ جاؤ لحد کے چوکھٹے میں
یہ گوشۂ بے اماں نہیں ہے

دیوانے ترے ، پڑے ہیں در پر
یہ مجمعِ مفلساں نہیں ہے

مدہوش ہیں تیرے عشق میں سب
یہ حلقۂ مے کشاں نہیں ہے

تم واجب القتل آدمی ہو
ہونے کا تمہیں گماں نہیں ہے

آیات سے ماورا ہے منزل
یہ نقشۂ رہزناں نہیں ہے

اب رہ گیا بس غبار باقی
محمل کا کوئی نشاں نہیں ہے

بے مہریِ دلبراں ہے اور ہم
دلداریٔ دلبراں نہیں ہے

دل مانگ رہے ہیں ، جان جاؤ
یہ تو کوئی چیستاں نہیں ہے

تنہا ہی ظفؔر بھٹک رہا ہے
میرا کوئی کارواں نہیں ہے

☆☆☆

غلام حسین ساجد

عطا سب کو متاعِ زندگی ہوتی رہے گی
مگر ہر بار مہلت میں کمی ہوتی رہے گی

نظرانداز کرسکتا ہے کیسے کوئی خود کو
زیاں ہوتا رہے گا ، بےکلی ہوتی رہے گی

ازل سے ہے تعلق عشق میں اور سرخوشی میں
دیا جلتا رہے گا ، روشنی ہوتی رہے گی

طبیعت پر اثرانداز ہوتی ہے رفاقت
ملاقاتیں رہیں گی ، دل لگی ہوتی رہے گی

سرِ میداں اُتاری جائے گی جب یاد اُس کی
سپر انداز اِک موج خفی ہوتی رہے گی

مہک آتی رہے گی جب تلک اُس گلبدن کی
قلم چلتا رہے گا ، شاعری ہوتی رہے گی

ٹھہر جائے گا شریانوں میں بہتا خون ساجؔد
مگر دل میں ذرا سی تھرتھری ہوتی رہے گی

غلام حسین ساجد

مرے دل سے مری موجودگی کا ڈر نکل جاتا
اگر میں نیند میں چلتے ہوئے باہر نکل جاتا

نہیں ہمت جمالِ صبح سے تکرار کی مجھ میں
مناسب تھا مرا غصہ چراغوں پر نکل جاتا

خوشی تقسیم کرنے کے لیے کوہ و بیاباں میں
حصارِ قریۂ غم سے بہ چشمِ تر نکل جاتا

ملی ہوتی مجھے مہلت اگر پرواز کرنے کی
کسی انجان صحرا کی طرف اُڑ کر نکل جاتا

مجھے اصلِ حقیقت جاننے کی آرزو کب تھی
مرے دل سے مگر یہ کذب کا دفتر نکل جاتا

کھلا ہوتا ہماری بےکلی کا حال گر اُن پر
تعاقب میں کسی گل رُخ کے سارا گھر نکل جاتا

کوئی شے گھر سے باہر لا نہیں سکتی مجھے ساجؔد
مگر میں اُس پری کے کھوج میں اکثر نکل جاتا

☆☆☆

غلام حسین ساجد

کھو کے آیا ہوں وہاں کچھ اور نہ کچھ لایا ہوں میں
صرف اُس وحشی اندھیرے سے نکل آیا ہوں میں

خود بخود بڑھتا چلا جاتا ہوں بادل کی طرح
اُس کے آنگن کے طلسمی پیڑ کا سایہ ہوں میں

ہجر آساں کر دیا کرتا ہے کارِ وصل کو
بھید مشکل سے مگر اِس بھید کا پایا ہوں میں

دُور جا سکتی ہے مجھ سے اور نہ پاس آتی ہے وہ
خوف بن کر اُس پری کے ذہن پر چھایا ہوں میں

ساتھ ہوں میں بھی زمانے کی روش کے رات دِن
یعنی دُنیا سے الگ ہوں اور نہ بے مایہ ہوں میں

جی کی جی ہی میں رہی جاتی تھی ساجدؔ، اس لیے
آج اُس کوچے میں جا کر دیر تک گایا ہوں میں

غلام حسین ساجد

وہ خواب جب مری آنکھوں سے دُور ہونے لگا
تو میرے ساتھ مرا آئنہ بھی رونے لگا

خُمارِ وصل نے مدہوش کر دیا تھا اُسے
مجھے بھی نیند سی آئی تھی میں بھی سونے لگا

حدودِ صحنِ چمن میں سما نہ پاتا تھا
وہ کم نما جو مری روح میں سمونے لگا

مری تمام توجہ تھی جب فقط مجھ پر
کسی کے روپ کا بادل مجھے بھگونے لگا

عجیب رنگ ہے اِس رات کی سیاہی کا
کہ وہ بھی اپنے چراغوں سے ہاتھ دھونے لگا

بالآخر آ ہی گیا فیصلے کا وقت سو میں
کسی کو پانے لگا اور کسی کو کھونے لگا

جسے سفیرِ سحر جانتا تھا میں ساجد
وہ میرے دل میں اندھیرے کا بیج بونے لگا

☆☆☆

غلام حسین ساجد

دیارِ ہجر کے سرو و سمن سے دُور رہ کر
بہت آزردہ رہتا ہوں چمن سے دُور رہ کر

یقیں رہتا ہے اپنی قوتِ بازو پہ میرا
زمیں کے پاس رہ کر اور گگن سے دُور رہ کر

بچھڑ کر جسم سے روحیں بھٹک جاتی ہیں کیسے
کبھی دیکھوں گا میں اُس کے بدن سے دُور رہ کر

بہت کچھ کر چکا ہوں شامل جاگیر، لیکن
پریشاں ہوں کسی لعلِ یمن سے دُور رہ کر

مجھے کھینچے لیے جاتی ہے کوئی تیز خوشبو
بہت بے تاب ہوں مشکِ ختن سے دُور رہ کر

کبھی بے زار ہو جاتا ہوں فصلِ تیرگی سے
کبھی خوش ہوں چراغِ انجمن سے دُور رہ کر

مجھے بھی چین مل پائے گا اپنے گھر میں ساجدؔ
پرندے خوش نہیں رہتے چمن سے دُور رہ کر

غلام حسین ساجد

دیارِ حلقۂ زنجیر سے لایا گیا ہوں
سو اِس در پر بہت تاخیر سے لایا گیا ہوں

لہو بن کر دمکتی ہے سحر میری رگوں میں
چمن زارِ شبِ تعزیر سے لایا گیا ہوں

صباحت خوش نہیں آتی مجھے شہرِ سَبا کی
سوادِ خطّۂ کشمیر سے لایا گیا ہوں

سیاہی آ نہ پائے گی مری آنکھوں پہ غالب
کہ میں کُنجِ شب دلگیر سے لایا گیا ہوں

نہیں کچھ فرق مجھ میں اور میرے دشمنوں میں
اُسی کوچے، اُسی جاگیر سے لایا گیا ہوں

لکھا جاؤں گا اک سیمیں بدن کی ڈائری میں
جدا کر کے کسی تحریر سے لایا گیا ہوں

کوئی باہر نکالے گا مجھے کس طرح ساجد
میں اس گھر میں کسی تدبیر سے لایا گیا ہوں

☆☆☆

غلام حسین ساجد

زرِ وحشت کو دامِ حُسن سے زنجیر کرکے
بہت خوش ہو رہا ہے وہ مجھے تسخیر کرکے

طلسمی پھول رکھ جاتا ہے کوئی آئنے پر
ملے گا کیا مجھے اس خواب کی تعبیر کرکے

گیا تھا اُس کی آنکھوں میں خوشی کا رنگ بھرنے
پلٹ آیا ہوں اُس کو اور بھی دلگیر کرکے

بہار آئے تو خصلت ہی بدل جاتی ہے اُس کی
سو آئے گا وہ اب کی بار کچھ تاخیر کرکے

نہیں ہے کوئی دلچسپی مجھے ظاہر سے، لیکن
خوشی ہوتی ہے حرفِ غیب کی تفسیر کرکے

بہرصورت تعلق ہے مجھے غارت گری سے
گرا سکتا ہوں میں اک شہر کو تعمیر کرکے

دلائی ہے فقط اک معرکے کی یاد ساجدؔ
عیاں اک خوبرو پر بُرشِ شمشیر کرکے

غلام حسین ساجد

نگاہ اُٹھتی ہے ہر بار اُس گلی کی طرف
تو مل کے کھینچئے دیوار اُس گلی کی طرف

شجر اُگائے تھے جو ہم نے اپنے آنگن میں
دکھائی دیتے ہیں دو چار اُس گلی کی طرف

زباں پہ مہر لگانے سے کچھ نہیں ہوگا
رواں ہے قوتِ اظہار اُس گلی کی طرف

ہمارے چاہنے والے اگر اجازت دیں
تو ہم بھی جائیں گے سو بار اُس گلی کی طرف

سحر کے وقت ٹہلتے ہوئے نکلتے ہیں
بہت سے صاحبِ کردار اُس گلی کی طرف

ہوائے تازہ میں کچھ دیر جھومنے کے لیے
اُچھال دیتا ہوں اخبار اُس گلی کی طرف

ردائے عالمِ اقرار کے بدلنے کو
گئی ہے جرأتِ انکار اُس گلی کی طرف

کرے گا کون سا منصف یہ فیصلہ ساجدؔ
ہیں سادہ لوح کہ پُرکار اُس گلی کی طرف

☆☆☆

غلام حسین ساجد

کسی کی یاد کے جنگل میں کھو چکا ہوں میں
خود اپنے آپ سے محروم ہو چکا ہوں میں

متاعِ خواب میسّر نہ آسکی تھی مجھے
فقط یہ وہم تھا میرا کہ سو چکا ہوں میں

ہنسوں گا دیر تلک آج میں زمانے پر
کہ اپنے آپ پہ بے طرح رو چکا ہوں میں

ہوئی ہے میرے لہو سے زمینِ دل سیراب
کسی کے ہجر میں آنکھیں بھگو چکا ہوں میں

سُلگ اُٹھی ہے کوئی یاد کیوں مرے دل میں
بہت دنوں سے اُنہیں بھول تو چکا ہوں میں

کسی کو کوئی ضرورت نہیں ستائے گی
کہ اس نگر میں گُلِ صبر بو چکا ہوں میں

مری شناخت اسی آئنے سے ہے ساجدؔ
وجودِ شعر میں کب کا سمو چکا ہوں میں

غلام حسین ساجد

شروع ہونے کو ہے خواب کا سفر میرا
کبھی دماغ، کبھی گھومتا ہے سر میرا

مگر یہ بات بہت دیر میں کھلی مجھ پر
مرے بغیر مکمل نہیں ہے گھر میرا

جہاں ٹکے ہیں نہ ٹک پائیں گے قدم میرے
قیام ہوگا کبھی اُس مقام پر میرا

ابھی وہ غور سے سنتا ہے بات لوگوں کی
ابھی ہے اُس کی طبیعت پہ کچھ اثر میرا

ہر ایک خوف سے آزاد ہو چکا ہوں میں
نکل گیا ہے مرے دل سے آج ڈر میرا

متاعِ خیر اکٹھی تو کر رہا ہوں میں
پلٹ پڑے نہ کہیں کاروانِ شر میرا

کہیں وہ پھول سی آنکھیں مری امانت ہیں
ذرا سا حق ہے کسی کے وجود پر میرا

میں ایک پل کو بھی غافل نہیں ہوا جس سے
اُسے خیال تک آیا نہیں مگر میرا

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

آتا ہے غم و درد کا طوفان کہاں سے
ہر روز نکل آتا ہے ثعبان کہاں سے

اڈے ہیں یہ شفاف گہر کیسے جبیں پر
آئے ہو مرے پاس پشیمان کہاں سے

امکان سے خالی نہیں اُمید کا پہلو
آئے گا اس انداز کا امکان کہاں سے

جب دل پہ ہی وارد نہ ہو ایقان کا پرتو
نادیدہ پہ لاؤں گا میں ایمان کہاں سے

سو لعنتیں سن کر بھی نکلتے نہیں گھر سے
لے آتے ہو اس طرز کے مہمان کہاں سے

اب یاد نہیں عہد گزشتہ کے بھی قصے
وارد ہوا اس رنگ کا نسیان کہاں سے

ڈاکٹر خیال امروہوی

رختِ جاں کچھ نہ ملا درد کی چادر کے سوا
کیا زمانے نے دیا کھال کے استر کے سوا

جو بھی سوچا نہ ہوا ، جس کو نہ سوچا وہ ہوا
اور کیا نام رکھیں اس کا مقدر کے سوا

اب نہ مذہب ، نہ تمدن ، نہ ثقافت کا وقار
کوئی معیار ہی باقی نہ رہا ''زر'' کے سوا

اپنی نظروں کو بنا لیں گے حیا کا مرکز
کوئی عورت نہ نظر آئے گی خواہر کے سوا

درد کا ذائقہ کچھ اور ، تصور کچھ اور
کون یہ ذائقہ چکھے گا سخنور کے سوا

جس تغزل کی رہی شاعر خوش گو کو تلاش
نام کیا اس کا لیا جائے ''گلِ تر'' کے سوا

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

میری تخلیق ہے کس واسطے اور حد کیا ہے
بے ثمر شاخ کی ترویج کا مقصد کیا ہے

سب جگہ بھوک ہے اور جنس بھی دو رنگ نہیں
پھر یہ اوطان کی ناخواستہ سرحد کیا ہے

کتنا پُر داغ ہے تاریخ میں انساں کا وقار
ایسے بونے کا یہاں کاٹھ ہے کیا قد کیا ہے

چشم ناواقف حالات سے کیا بات کریں
جس پہ کھلتا ہی نہیں خیر ہے کیا ، بد کیا ہے

نرم بستر کو ہی سوغات سمجھنے والو
کیا تمہیں علم کہ بے رحمیٔ مرقد کیا ہے

ناطقہ تنگ ہے الفاظ کی اوقات ہی کیا
کس سلیقے سے کہیں قریۂ مشہد کیا ہے

علم نے سوچ کی تاویل بہت کی لیکن
آج تک کھل نہ سکا علم کی ابجد کیا ہے

ڈاکٹر خیال امروہوی

کسے فرصت سنے اوہام کا افسانہ روزانہ
کتھائیں کون سنتا ہے یہاں روزانہ روزانہ

وہی نا فہم ریکھائیں وہی راہیں بیابانی
کہاں تک آدمی دیکھا کرے ویرانہ روزانہ

ہمیشہ کھلنے والی مسجدوں سے خوف آتا ہے
ادھر کھلتا نہیں مہنگائی میں میخانہ روزانہ

دل انساں میں جو بیٹھا ہے وہ کب باز آتا ہے
کہ اُس کے شغل کی تکمیل ہے بہکانہ روزانہ

جہاں ہو برق کب روشن ملی شمع شبستانی
کسی نے گھومتا دیکھا ہے کب پروانہ روزانہ

یہی وہ قاتلینِ شہر استبداد ہیں جن کو
ملا کرتا ہے خفیہ فنڈ سے بیعانہ روزانہ

مری عظمت سمجھ افکار کی سب قدر کرتے ہیں
لپٹ جاتا ہے اپنا ہو کہ ہو بیگانہ روزانہ

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

میں اپنے حصول میں لگا ہوں
اک شوق فضول میں لگا ہوں

اک پھول ہوں میں بہت انوکھا
اک شاخ ببول میں لگا ہوں

چھیڑی تھی کل ایک بحث یونہی
اب ردّ و قبول میں لگا ہوں

پیوند ہوں انحراف جاں کا
ملبوس اُصول میں لگا ہوں

احمد صغیر صدیقی

بدیسی تھا نگر میرا نہیں تھا
میں کیا رہتا کہ گھر میرا نہیں تھا

یہاں سب کے سفر تھے اپنے اپنے
پرندہ ہم سفر میرا نہیں تھا

جھکانا اس کو مجبوری تھی میری
اُٹھاتا کیا کہ سر میرا نہیں تھا

بہت رسمی تھی میری مسکراہٹ
یہ فعل معتبر میرا نہیں تھا

نجومی تھا ، مگر تقدیر دیکھیں
ستارہ اوج پر میرا نہیں تھا

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

جو کچھ نہیں دیکھا تھا کبھی خواب میں دیکھا
نغمہ چھپا بیٹھا ہوا مضراب میں دیکھا

اک ڈھنگ جنوں میں بھی ملا مصلحت آمیز
اک رنگِ بغاوت ادب آداب میں دیکھا

جل تھل سے نظر آئے کنارے کے مناظر
ساحل کا سماں حلقۂ گرداب میں دیکھا

پھر آئینہ دیکھا نہ کبھی ہم نے پلٹ کر
کیا جانیے کیا دیدۂ پُر آب میں دیکھا

دھندلائی ہوئی سی تھی یہ تصویر ، نہ بدلی
اپنے کو بہت اپنی تب و تاب میں دیکھا

احمد صغیر صدیقی

گہرے سمندروں میں اُترتا ہوں خواب میں
سب ڈوبتے ہیں اور میں اُبھرتا ہوں خواب میں

میں جاگتا ہوں صرف سمٹنے کے واسطے
مت پوچھیے میں کتنا بکھرتا ہوں خواب میں

جتنی بگاڑتی ہیں یہ بیداریاں مجھے
میں اتنی ہی لگن سے سنورتا ہوں خواب میں

جاتا ہوں گھر سے دن میں نہ آنے کے واسطے
پھر رات بھر اُسی میں ٹھہرتا ہوں خواب میں

جس کے لحاظ پاس میں کٹتی ہے زندگی
اس عہد سے میں روز مکرتا ہوں خواب میں

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

کھنچی ہوئی تھی زمیں آسماں سے آگے بھی
مرا مکاں تھا بہت سا، مکاں سے آگے بھی

چلا رہا تھا میں اپنی دکان شوق وہیں
جہاں زیاں ہی زیاں تھا، زیاں سے آگے بھی

میں ایک لامتناہی سفر پہ نکلا تھا
سو خاک اُڑتی رہی خاکداں سے آگے بھی

جو سوچتا، تو فقط جسم و جاں ہی کیوں رہتا
کہ سوچنا تھا مجھے جسم و جاں سے آگے بھی

وہی یقیں و گماں تھے، نکل کے دیکھ لیا
طلسم زار یقیں و گماں سے آگے بھی

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

غبارِ عکس سے اک آئینہ بناؤں گا
میں حیرتوں کا کوئی سلسلہ بناؤں گا

یہ دیکھنے کے لیے زعم کیا ہے جرأت کیا
ہوا بناؤں گا پھر اک دیا بناؤں گا

کچھ اور طرح کا آغاز میری عادت ہے
میں اختتام کوئی دوسرا بناؤں گا

مٹا رہا ہوں ابھی سب بنی ہوئی چیزیں
ابھی بتا نہیں سکتا میں کیا بناؤں گا

قیوم طاہر

ختم ہوتا ہی نہیں جیسے تماشا مجھ میں
ایک دیوار بھی ہے ایک ہے رستہ مجھ میں

سانس لیتا ہے پرانا سا کھنڈر بھی اکثر
سرسراتا ہے کسی سانپ کا لہجہ مجھ میں

کوئی بادل بھی نہ اترا نہ کہیں بوند پڑی
جیسے ٹھہرا ہو کوئی ریت کا دریا مجھ میں

ایک بھولی ہوئی کھڑکی کو جو خوشبو کھولے
جاگ جاتا ہے کسی نام کا پہرہ مجھ میں

کٹتے جاتے ہیں سبھی ساحلِ جاں کے رشتے
ڈوبتا جاتا ہے پھر ایک جزیرہ مجھ میں

مجھ سے اپنی ہی وہ تفصیل چھپانا چاہے
بنتی، مٹتی ہوئی تمثیل کا خاکہ مجھ میں

اب تو بس روح میں رچنا ہے مہک نے قیوم
پھولنے پر ہے ترے درد کا پودا مجھ میں

☆☆☆

قیوم طاہر

کسی شکستہ دریچے کا ایک دیا سا میں
تو پھر یہ کیا تھا کہ دشمن ہوا سے اُلجھا میں

میں چھپ چھپا کے کسی روز چھت پہ آؤں گا
وفا کروں گا کبھی موت سے بھی وعدہ میں

نہ ایک لمحہ ملا ہجر کے زمانوں سے
کہ قرب کھاٹ کی خاطر بھی بان بُنتا میں

بس ایک جست کی خواہش کہ پار اُتروں گا
مگر ہلا بھی، تو بس ایڑیوں پہ گھوما میں

اسی تلاش میں کندن سا جسم راکھ ہوا
کہ چھان چھان تھکا ریت میں سے سونا میں

مجھے ہی چھوڑ گئی رات اپنے جنگل میں
نئے جہاں کے کسی خواب سے تھا اُجلا میں

کبھی اکائی کی صورت، کہاں ملے قیوم
کہیں پہ نصف ہے تُو، اور کہیں پہ آدھا میں

قیوم طاہر

کچھ کہوں بھی تو کیا لکھے پر میں
خوش نہیں ورنہ فیصلے پر میں

جیسے کہرے کا کھیس اوڑھے ہوئے
دھوپ سے تھوڑے فاصلے پر میں

ورنہ دنیا کہاں کے رہنے کی
جی رہا ہوں ترے کہے پر میں

تُو بھی وقتوں کی انتہا پر ہے
اور زمانوں کے اک سرے پر میں

قافلے کا یہی تو رستہ ہے
کب سے بیٹھا ہوں راستے پر میں

روبرو جب مرے ہوا آئی
شرط باندھوں گا تب دیے پر میں

عکس میرا ہی میرا دشمن ہے
وار کرتا ہوں آئینے پر میں

قیوم طاہر

اُجلے لفظ کا قرض چکانا چاہوں میں
کونج کی صورت اب گُر لانا چاہوں میں

حدِّ افق تو پل دو پل کا فاصلہ ہے
حدِّ افق سے آگے جانا چاہوں میں

تیز ہواؤں والی سہمی گلیوں میں
دیواروں پر دیا جلانا چاہوں میں

بستی میں عفریت ہیں پھر بھی آنکھوں کو
پریوں والے خواب دکھانا چاہوں میں

شاید کوئی اجڑی شاخ چمک اُٹھے
کالے پیڑ پہ چاند اگانا چاہوں میں

وہ بھی آنکھیں کھولے، سوچے اور بولے
اُس کو اپنا روگ لگانا چاہوں میں

اب آنکھوں سے کوئی بات نہ پوچھوں گا
اب آئینے کو دھندلانا چاہوں میں

☆☆☆

حصیر نوری

ایسا چونکا دینے والا واقعہ کیسے ہوا
زندگی میں یہ اچانک حادثہ کیسے ہوا

ایک عرصے سے میں اپنے آپ میں روپوش تھا
میں ابھی زندہ ہوں یہ تم کو پتہ کیسے ہوا

منکشف کرنا ضروری تو نہیں ہر بات کا
زندہ رہنے کا یہ مجھ میں حوصلہ کیسے ہوا

یہ بتانے کی کسی کو اب ضرورت ہی نہیں
تم کو میری دوستی سے فائدہ کیسے ہوا

میری نکتہ چینیوں سے لطف آتا تھا اسے
پھر وہ میری گفتگو سے بے مزہ کیسے ہوا

دیکھتے ہی دیکھتے پہنچا وہ بام اوج پر
اتنے کم عرصے میں طے یہ مرحلہ کیسے ہوا

اس کے مرنے کا مجھے خود بھی بہت افسوس ہے
سوچتا رہتا ہوں میں یہ حادثہ کیسے ہوا

شاعری میرے لیے کب وجہِ عزت تھی حصیرؔ
ہوں تعجب میں ، یہ آخر معجزہ کیسے ہوا

حصیر نوری

گزرے ہوئے لمحات کی یہ جلوہ گری ہے
سنسان کھنڈر میں بھی صدا گونج رہی ہے

اس شہر میں وہ شخص بھی ہے داد کے قابل
جو خود ہی سمجھتا ہے کہ کیا مجھ میں کمی ہے

یارو مجھے دیکھو نہ حقارت کی نظر سے
بدلے ہیں خدوخال مگر ذہن وہی ہے

دیکھو تو مرے گھر میں اتر آیا ہے سورج
دیواروں پہ ہے دھوپ کہ سونے کی لڑی ہے

چہرے کا تاثّر یہ بتاتا ہے کہ دل میں
سائے کی طرح درد کی دیوار کھڑی ہے

اے ڈھونڈنے والو! تنِ لاغر میں نہ ڈھونڈو
خوشبو مری محنت کے پسینے میں چھپی ہے

بدلے ہوئے حالات سے کیوں خوف نہ آئے
اس شہر میں عزت مجھے محنت سے ملی ہے

چہرہ تو حصیرؔ آج سبھی دیکھ رہے ہیں
آواز یہاں کس نے مرے دل کی سنی ہے

☆☆☆

حصیرنوری

درد کی دھوپ میں ڈستی ہے تمنا مجھ کو
راس آیا نہ تری زلف کا سایہ مجھ کو

مجھ کو کچھ دے نہ سکا جھوٹی تسلّی کے سوا
ہجر کی آگ میں برسوں سے جلایا مجھ کو

میں جو چڑھتے ہوئے سورج کا پجاری نہ بنا
اپنی نظروں سے زمانے نے گرایا مجھ کو

خود پرستوں کی محبت نے یہ دن دکھلایا
کر دیا وقت نے اس دَور میں رسوا مجھ کو

کوششیں سامنے آئیں جو ابھر کر میری
وسعت فکر نے احساس دلایا مجھ کو

پھراسی سمت میں یادوں کے سہارے اک دن
لے گیا دشتِ تخیل کا بگولا مجھ کو

اپنے دشمن سے کروں ذکر بھلا کیسے حصیرؔ
اپنے احباب نے جس طرح ستایا مجھ کو

☆☆☆

حصیرنوری

میں حادثوں کی زد پہ ابھی ہوں کھڑا ہوا
ہونٹوں پہ کیوں تمہارے ہے تالا لگا ہوا

ہر سمت آتشیں ہیں گلستانِ رنگ و بو
گلزارِ آرزو میں دھواں ہے بھرا ہوا

کھویاہواہوں گہرےاندھیرے میں جانے کیوں
پہلو میں جب کہ ہے مرے سورج چھپا ہوا

گم ہوگئی ہے ذرّوں میں سورج کی ہر کرن
صحرا کا ذرہ ذرہ ہے شعلہ بنا ہوا

احساس کی حدوں سے پرے بھی دکھائے گا
ذہنوں میں فکر نو کا دریچہ کھلا ہوا

اب خواہشوں کے ہاتھ ہے پتھر کی زندگی
وہ کھا رہا ہے خوف تو نقصان کیا ہوا

کتنا ہے دلخراش یہ لمحہ حیات کا
قسمت میں کیا حصیرؔ تھا یہ بھی لکھا ہوا

☆☆☆

پرویز ساحر

وفُورِ روشنی نے مار ڈالا
کسی کو مار ڈالا ہے قضا نے
نہ جانے کتنے ہی سادہ دلوں کو
میں یہ بھی کہہ نہیں سکتا کسی سے
وہ جیتے جی جہاں میں ہوگیا غرق
میں ایسے مرنے والا کب تھا، مجھ کو
یہاں جس جس نے بھی آواز اُٹھائی
کبھی بھی ہاتھ پھیلائے نہ اپنے
کوئی افراطِ غم سے مر گیا ، اور
میں تا عمر اُس سے کہہ پایا نہ کچھ بھی
مرے اندر جو اِک شاعر تھا، اُس کو
جو مارے سے نہ مرتا تھا، اُسے بھی
خدا معلوم کتنے اژدہوں کو
مجھ ایسا غم زدہ بھی کم ہی ہوگا

مجھے اِس آگہی نے مار ڈالا
کسی کو زندگی نے مار ڈالا
تری قاتل ہنسی نے مار ڈالا
کہ مجھ کو اک پری نے مار ڈالا
اُسے اپنی بدی نے مار ڈالا
تمہاری بے رُخی نے مار ڈالا
اُسے مل کر سبھی نے مار ڈالا
مجھے میری خودی نے مار ڈالا
کسی کو اِک خوشی نے مار ڈالا
مجھے اس اَن کہی نے مار ڈالا
عدیم الفرصتی نے مار ڈالا
غرورِ افسری نے مار ڈالا
عصائے موسوی نے مار ڈالا
مجھے افسردگی نے مار ڈالا

سنا ہے آج بھی گاؤں میں ساحرؔ
کسی کو پھر کسی نے مار ڈالا

☆☆☆

پرویز ساحر

تُو لاکھ چھپا مگر اے پیارے
ہم خوب سمجھتے ہیں اشارے

ہر سمت وہی ہے جلوہ فرما
ہر سمت اُسی کے ہیں نظارے

کوئی بھی سمجھ سکا نہ اُس کو
سب فلسفی سوچ سوچ ہارے

کب تک کوئی اُس کی راہ دیکھے
کب تک کوئی اُس کو انتظارے

پھر پیاسوں نے ڈالا ہے پڑاؤ
دریائے فرات کے کنارے

جس لمحے جدا ہوا وہ مجھ سے
دن میں نظر آئے مجھ کو تارے

مانندِ برگِ خشک ہر سُو
بکھرے ہیں زیست کے شمارے

جانا ہے تو شوق سے چلا جا
بیکار بہانے مت بنا رے

کس نام سے میں تجھے پکاروں؟
سو نام ہیں شہر میں تمہارے

کیا کوئی شرر نہیں ہے دل میں؟
کیا بجھ گئے سب کے سب شرارے

رو رو کاٹی ہے عمر میں نے
رو رو ہستی کے دن گزارے

بہتر ہے زبان بند رکھو
کھل جائیں نہ پچھلے گوشوارے

اوقات ہی کیا بھلا ہماری
ہم لوگ ہیں وقت کے مزارع

اس کارِ عاشقی میں ہم نے
تا عُمر اُٹھائے ہیں خسارے

نا خوب کو خوب جانتے ہیں
معیار ہیں مختلف ہمارے

کیوں کر نہ عزیزِ جاں ہوں مجھ کو
سب شعر ہیں اس جگر کے پارے

حسرت ہے کہ اس جہاں میں ساحر
کوئی ہمیں پیار سے پکارے

☆☆☆

شام جعفری

درد و غم کے راستوں پر بے کسی اچھی لگی
ٹھوکروں کی زد میں آتی زندگی اچھی لگی

بھیگتے ساون کی رُت میں بھی سلگتے جسم و جاں
وصل کے موسم میں اشکوں کی جھڑی اچھی لگی

شبنمی یادوں کے لمحے اور گہری خامشی
آخرِ شب سوگ اوڑھے چاندنی اچھی لگی

عنبریں زلفوں کی خوشبو مرمریں باہوں کا لمس
زیست کے لمبے سفر میں یہ کمی اچھی لگی

پَو پھٹے کا مختصر لمحہ بڑا اچھا لگا
شام کے سایوں میں ڈھلتی روشنی اچھی لگی

شام جعفری

اب یہ مسکن کسی آسیب کا گھر لگتا ہے
اب تو آجاؤ کہ تنہائی سے ڈر لگتا ہے

اب تو آ پہنچی ہے منزل بھی سرِ راہِ حیات
رائیگاں جاتا ہوا سارا سفر لگتا ہے

خود فریبی اسے سمجھیں کہ نظر کا دھوکا
اپنا وہ ہے تو نہیں اپنا مگر لگتا ہے

ہم محبت نہ کریں تم ہی کہو جائیں کدھر
راستہ ایک یہی ہے جو امر لگتا ہے

شامؔ اشکوں سے سنورتا ہے دعاؤں کا شجر
اور پھر یہ کہ دعاؤں کو ثمر لگتا ہے

☆☆☆

طارق اسد

آشنا تُو بھی نہیں ہے آشنا میں بھی نہیں
مانتا تُو بھی نہیں ہے مانتا میں بھی نہیں

یہ تعلق تو ہے قائم مصلحت کے واسطے
با وفا تُو بھی نہیں ہے، باوفا میں بھی نہیں

کون کس کو کس جگہ پر چھوڑ کر چلتا بنے
جانتا تو بھی نہیں ہے، جانتا میں بھی نہیں

لب کشائی کی تمنا بھی لہو میں ہے مگر
بولتا تو بھی نہیں ہے بولتا میں بھی نہیں

پھر رہے ہیں ہم شرافت کے لبادے اوڑھ کر
پارسا تُو بھی نہیں ہے پارسا میں بھی نہیں

وہ بھی سو جاتا ہے لمبی تان کر طارق اسدؔ
اور راتوں کو اکیلے جاگتا میں بھی نہیں

طارق اسد

جب آغازِ مسافت ہم کریں گے
تو ہر ٹھوکر سے الفت ہم کریں گے

ہمیں حاصل رہی ہے تیری نفرت
ترے دل پر حکومت ہم کریں گے

تجھے چھونے کی خواہش ہے لہو میں
تجھے چھونے کی جرأت ہم کریں گے

تری خوشیوں میں شامل تھا زمانہ
ترے دکھ میں شراکت ہم کریں گے

کوئی لمحہ مسرت کا ملے گا
تو اظہارِ مسرت ہم کریں گے

کوئی جب منتظر ہوگا ہمارا
تو گھر جانے میں عجلت ہم کریں گے

تجھے بستی میں رہنا ہے ہمیشہ
ترے حصے کی ہجرت ہم کریں گے

☆☆☆

اوصاف نقوی

عناصر کے قفس میں تو مکیں ہے
خودی کے راز سے واقف نہیں ہے

تو بیگانہ ہے اک سجدے سے اب تک
بتوں کے آگے خم تیری جبیں ہے

ترے افکار مالا مال شک سے
تو اس دنیا میں نادار یقیں ہے

تری سیرت کو ہے تجھ سے شکایت
تجھے ہے زعم صورت میں حسیں ہے

ہوا کے دوش پر ہوگی امیری
فقیری خاکساری کی امیں ہے

زباں پر حمد کا بے جاں ترانہ
صنم اوصاف کوئی دل نشیں ہے

حسن عباسی

شام سے پہلے کوئی حشر بپا ہوتا ہے
روز اک خوف مرے دل میں نیا ہوتا ہے

تجھ کو رخصت کروں کیسے کہ مرا دکھ ہے یہی
پھر نہیں ملتا جو اک بار جدا ہوتا ہے

کون کرتا ہے تعاقب کہ جہاں بھی جاؤں
مُڑ کے دیکھوں تو کوئی پھول پڑا ہوتا ہے

جس میں نقصان ہی نقصان ہو سارا دل کا
کام وہ کرنے کا اک اپنا مزا ہوتا ہے

حوصلہ ہارنا اچھا نہیں لگتا اس کو
آنکھ بھر آئے تو وہ مجھ سے خفا ہوتا ہے

غصہ آتا ہے کسی اور کی باتوں پر حسنؔ
دل کسی اور کی باتوں سے دُکھا ہوتا ہے

☆☆☆

ظفر اقبال نادؔر

بدلا بدلا اُن کا لہجہ دیکھئے
ڈوبتا شہرِ تمنا دیکھئے

مان لیتے ہیں وفا تیرا طریق
میری جانب بھی ذرا سا دیکھئے

چار جانب حسرتوں کی ریگ ہے
خشک ہوتا خواب دریا دیکھئے

ایک دل تھا جو کسی کا ہو گیا
غیر تو ہیں غیر اپنا دیکھئے

اب محبت کا کرو اقرار بھی
اور مت دل کا تماشا دیکھئے

ہر قدم ہیں جاں کشاں سے حادثے
ہاتھ رکھ سینے پہ دُنیا دیکھئے

آ بجھا ڈالیں چراغِ ہجر کو
جل نہ جائے دل ٹھکانہ دیکھئے

اس کا باعث ہے تری موجودگی
مت مری نبضوں کو چلتا دیکھئے

اعجاز الرحمٰن قاضی

فصل گل ہے ، بہار ہے اب بھی
پہلوئے گل میں خار ہے اب بھی

سوئے مقتل چلے ہیں دیوانے
منزل عشق ، دار ہے اب بھی

کارواں اک ادھر سے گزرا تھا
سرِ رہ جو غبار ہے اب بھی

وصل کی رات آ گئی ، لیکن
رات دن کا شمار ہے اب بھی

ہم سبکبار ہو گئے دل سے
سر کہ شانوں پہ بار ہے اب بھی

فصل گل کب کی جا چکی ، لیکن
داغِ دل پُر بہار ہے اب بھی

اب کہاں در سے اس کے ہم جائیں؟
ہاں، خفا ہم سے یار ہے اب بھی

گرچہ منظر بدل گیا اعجازؔ
آنکھ میں وہ خمار ہے اب بھی

☆☆☆

کرنل دل نواز دلؔ

بابائے خیر و برکت

(جناب اشفاق احمد کی وفات پر کوچۂ دل میں لگائی گئی ایک درد بھری صدا)

مہر و مہ اشفاق کے سائے میں ہیں
اور انجم اس کے ہمسائے میں ہیں

آسمانِ فن کی وہ تھا کہکشاں
وہ ادب آداب کا تھا آسماں

اُس کے دم سے دم بہ دم تھی زندگی
اُس نے دل سے کی خدا کی بندگی

وہ کروڑوں میں یقیناً ایک تھا
اک خدا کا تھا وہ بندہ نیک تھا

اُس نے دنیا میں نبھایا دین کو
کر لیا وِرد زباں آمین کو

اِک محبت کے فسانے سو(۱۰۰) لکھے
خوب سے تھے خوب تر وہ ، جو لکھے

کی عبارت جاں نبیؐ کے ذکر سے
بات کی رب کی بڑے ہی فکر سے

اُس نے ساری عمر لکھا اور پڑھا
علم کی سیڑھی عمل ہی سے چڑھا

وہ 'گڈریا' تھا سخن کے غول کا
وہ تھا پکا اور پیڈا قول کا

اُس کی آنکھوں میں سہانے خواب تھے
جو رواں تعبیر سے سیراب تھے

محفلِ یاراں کی وہ جند جان تھا
شان تھا ، بزم سخن کا مان تھا

زندگی کو اُس نے دیکھا غور سے
ہر طریقے اور ہر اک طَور سے

موت اُس کی ہو گئی ہونا ہی تھی
آنکھ ایسی موت پر رونا ہی تھی

اُس کی باتیں یاد آئیں گی سدا
دے گیا ہے جو دَرِ دل پر صدا

اُس کی باتوں میں عجب اک بات تھی
بات کیا تھی ، چودھویں کی رات تھی

مشکلوں سے کر کے اپنی ابتدا
کر گیا آسانیوں کی انتہا

وہ تھا بابا ، جس پہ بابے تھے فدا
ہو گیا آخر وہ بابوں سے جُدا

داستاں ہے اب سرائے سے الگ
مہربانی ہے برائے سے الگ

یاد بن جائے گی بانو قدسیہ
بھول کیا پائے گی بانو قدسیہ

اجنبی وہ ، دلؔ تھا جس سے آشنا
غیریت کی کر گیا ہے انتہا

فہیم شناس کاظمی

اب کسی کا کوئی بھروسہ نہیں

شام سیلاب کی طرح آئی
چاند نے دکھ سے خودکشی کر لی
آئینہ عکس چھُو کے ٹوٹ گیا
سبز گندم جلی دسمبر میں
میں کسی راستے سے گزرا نہیں
سنگ باری ہے کس لیے جاری
شہر اپنے ہی غم میں ڈوب گیا
کالے تیتر نے دھوپ پی لی ہے
کوے اب ہنس چال چلتے ہیں
آم میں فاختہ نہیں کوئی
سب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
آنکھیں کاری کی طرح خوں آلود
لمحہ لمحہ کلہاڑی جیسا تیز
بے کفن جسم دفن ہوتے رہیں
کس قیامت کی اپنی غیرت ہے
کم سنوں سے نکاح ہوتے ہیں
پریوں سے محوِ اختلاط ہیں دیو
رلی جیسا وجود ہے میرا
جس کے زخموں کی خوش نمائی پر
کم نسب اپنی ذات تھوکتے ہیں
گر خدا بھی زمین پہ آجائے
فیصلہ اس کا بھی کریں گے شیوخ
جن کے گھر پر سفید جھنڈے ہیں
کس سمندر میں کون ڈوبے گا
کس زمانے میں کس کی شاہی ہو
سبز پیڑوں کو کچھ نہیں معلوم
جن کی ہر شاخ سے ہوا کا وصال
جانے کب کیا کمال ہو جائے
راہ دریا بدل بھی سکتا ہے
زلزلہ مہمان ہو بستی کا
خواب کا زہر پھیل سکتا ہے
دھوپ جنگل سے روٹھ سکتی ہے

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

انجانے خوف میں چھپا شہر

گہری دھند ہے چاروں جانب
آئینے ویران پڑے ہیں
بے جاں سے اشجار کھڑے ہیں
خوف سے خون ہوا ہے پانی
تاریکی ہر اک منظر پر
شہر کراچی
تیرا ہر دن ___ رات
قیامت سے بھاری ہے
خوف کا موسم طاری ہے

☆☆☆

پھر کوئی بات کوئی بات نہیں

آنکھ جو دیکھتی ہے
دیکھتی ہے
خواب جو بُنتی ہے
سو بُنتی ہے
رات رونے سے نہیں ڈھل سکتی
جنگ باتوں سے نہیں ٹل سکتی
خامشی جنگ کی تیاری کا اک وقفہ ہے
ہم نے تاریخ کے صفحے سے پڑھا
گفتگو جبر کو پھیلاتی ہے
دھند نظر پہ اتر آتی ہے
جب ہوا کرتی ہے بادل سے کلام
ہم نے یہ وقت کی تختی سے پڑھا
معجزہ ہے نہ کرامت کوئی
خود میں گر عزم و عمل باقی نہیں
پھر کوئی بات کوئی بات نہیں
ہم نے یہ خون سے صحرا پہ لکھا
جو مٹا سکتے نہیں ہیں خود کو
ان کو ملتا کبھی اثبات نہیں

☆☆☆

خالد ریاض خالدؔ

ضد کی بُکل اس کی لحد ہے

رات نے نیند چھین لی ہے
سنّاٹا چہرے پہ ٹھہر گیا ہے
اس نے ایک پچھتاوے کی پرورش کی تھی
اور اکلاپے کو گلے لگایا ہے
محرومیوں کا لباس پہن کر
دن کی جھولی سے
خوشی کے اسباب ڈھونڈتا ہے
پرانے زنگ لگے دنوں میں
پرانا ساتھی کھو جتا ہے
بچھڑنا موت کی علامت ہے
اب ضد کی بُکل اس کی لحد ہے

☆☆☆

ایک اور جنم کا وعدہ ہے

اب لوٹ آؤ
راکھ کا ایک ڈھیر بچا ہے
اسے سرپھری ہوا کی نذر کرو

☆☆☆

خالی ہاتھوں کا لمس

جب بدن ہوا ہے مانندِ گور
تو اُٹھے ہیں کتنے ہاتھ
مٹی سے لتھڑے ہوئے
ان خالی ہاتھوں کا لمس
اب صحرا میں بادل کا سایہ ہے
دل کا چاند ڈوب گیا ہے
اور آنکھوں کا سفر رائیگاں نہیں گیا
ڈھونڈو تو ماتھے پہ کہیں لکھا ہے
ہوا کی طرح
محبت کبھی پرانی نہیں ہوتی

☆☆☆

مراجعت

ہم کہ دریا تھے
پی گیا ایک کنواں ہم کو
اور پھر نکل گئی کنویں کو
مٹی اس کی اپنی

☆☆☆

حروفِ زر
(قارئین کے خطوط)

بہت دنوں بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ اس دوران میں پاکستان میں برائے نام رہا۔ کبھی ایک آدھ ہفتے کے لیے آ بھی گیا تو اپنے مسائل میں اتنا گھرا رہا کہ کسی دوست کو خط لکھ سکا نہ اپنے آنے کی اطلاع فون پر دی۔ وقت ہی نہیں تھا۔ ڈاک میں آپ کے خطوط اور رسالے ملتے رہے اور وہ اپنے ساتھ لے جاتا رہا اور راستے میں مستفید ہوتا رہا۔ چاہتا تھا کہ تھوڑا سا سکون ملے تو سب خطوں کے جواب بھی دوں گا اور جو کچھ لکھا ہے، احباب کی نذر بھی کروں گا مگر ___ اب وہ دن آیا ہے۔ پہلا خط آپ ہی کو لکھ رہا ہوں۔ اتفاق سے آج ہی ''انگارے'' (۲۲) مجھے ملا۔ سب سے پہلے ٹیگور کا ناول ''گاندھی'' پڑھا۔ جارج لوکاش کا ترجمہ ہے جس میں ٹیگور کی شخصیت اور اس کے ناول (کتابچہ) کا جائزہ لیا گیا ہے حبیب اللہ کاشف صاحب نے اچھا ترجمہ کیا ہے۔ بہت رواں ہے مگر مجھے مضمون نگار کے خیالات سے اختلاف ہے۔ مانا کہ وہ مارکسسٹ ہیں، ہیگل اور مارکس کا تقابلی مطالعہ رکھتے ہیں مگر ''شاید'' ہندوستان، گاندھی جی اور ٹیگور سے اتنے واقف نہیں، جتنا ہونا چاہیے۔ کہنے کو تو بہت ہے مگر فی الحال میں اس موقف میں نہیں کہ تفصیلی مضمون یا مقالہ لکھ سکوں۔ صرف اتنا ضرور لکھنا چاہوں گا کہ ہندوستان میں گاندھی جی کو ''مہاتما'' اور ٹیگور کو ''مہاکوی'' کہا جاتا ہے اور ہندوستان میں پڑھے لکھے باشعور لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں بنگالی بہت وسیع اور وقیع زبان ہے۔ اس کا ادب بھی ''اعلیٰ مقام'' رکھتا ہے ان شخصیتوں کے خیالات یا اُن کے عقائد یا اُن کے کارناموں سے اختلاف رکھنے والے بھی ہیں مگر کوئی اُن کی شخصیت کی عظمت کا منکر نہیں۔ محض نوبل پرائز سے ٹیگور ''مہاکوی'' نہیں بن گئے اور محض ہندو یا کانگریسی ہونے کے ناطے گاندھی جی ''مہاتما'' نہیں گردانے گئے۔ بہت سی ایسی فضیلتیں بھی ان شخصیتوں سے وابستہ ہیں جن سے بالخصوص ہماری نئی نسل واقف نہیں ہے۔

بدنصیبی سے ہماری اس نسل کا خمیر ''نفرت'' سے اُٹھا ہے اور نفرت وہ کینسر ہے جو ''صحت'' کا دشمن ہے اس لیے ذہنی اور قلبی صحت کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ آپ کا رسالہ ترقی پسند نظریات کا علم بردار ہے۔ آپ یقیناً کسی بے بنیاد ''نفرت'' کے قائل نہیں ہوں گے۔ ہماری سیاسی اور بالخصوص مذہبی تاریخ جن مراحل سے گزری ہے، اُس میں اکثر مقامات یا مخالفتوں کا تعلق صرف ''جذبات'' سے ہے یا اُن تعصّبات سے جو ہمیں ''لاعلم یا جاہل'' بزرگوں سے ورثے میں ملی ہیں۔ خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔ فی الحال میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا۔ ہماری ساری غلط فہمیوں کا علاج ''تعلیم'' سے ہے اور بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اسی کا فقدان ہے۔ پہلے تو ہمیں تعلیم ملے پھر وہ ''شعور'' حاصل ہو جو اعلیٰ ذہنوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ بلاشبہ ہمارے ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں مگر معدودے چند، آپ کا رسالہ اُنہیں کی نمائندگی

کرتا ہے، بہت اچھے مضامین بھی چھپتے ہیں مگر ایسے بھی جس کی مثال یہ مضمون ہے۔ضرورت اس بات کی تھی کہ گاندھی جی پر ٹیگور کے کتابچے کا ترجمہ بھی دے دیا جاتا تا کہ اس ''محاسبے'' کا تجزیہ ہوسکتا۔ پچھلے دنوں ایک مخصوص مسئلہ کے سلسلے میں اپنی لائبریری میں رسائل کی ورق گردانی کر رہا تھا تو اتفاق سے مئی جون ۱۹۶۱ء کا ماہنامہ ''صبا'' (حیدرآباد دکن۔انڈیا) ہاتھ آ گیا۔اس میں مہا کوی ٹیگور پر ایک مضمون ہے۔ مضمون نگار اختر حسن، بڑے عالم فاضل ''صحافی'' بھی تھے برسوں قاضی عبدالغفار (مصنف لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری) کے اخبار ''پیام'' کے مدیر بھی رہے اور پھر اپنا اخبار ''عوام'' برسوں تک حیدرآباد دکن سے نکالتے رہے۔فارسی ادب پر بھی گہری نظر تھی۔کئی تراجم کیے اور ساتھ ہی اپنی یادداشتیں بھی لکھیں جن میں دکن کے انقلابی شاعر ''مخدوم محی الدین'' کی رفاقت کی پوری تفصیل ہے۔(مخدوم کا کلام یہاں بھی کتابی صورت میں سبط حسن صاحب نے شائع کیا تھا۔''مخدوم اور اس کی شاعری'') اُن کا یہ شعر کس نے نہیں سنا

حیات لے کے چلو ، کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اختر حسن کیفی اعظمی کے ہم زلف بھی تھے اور دکن کے بڑے ترقی پسندوں میں شمار ہوتے تھے۔اُن کا مضمون جو کسی انگریزی مضمون کی روشنی میں لکھا گیا ہے، قابل مطالعہ ہے۔میرا خیال ہے ہماری نئی نسل کے اکثر شعراء ٹیگور کی تخلیقات سے واقف نہیں اور ان کی زندگی سے بھی شاید ہی واقف ہوں۔ہاں نوبل پرائز کے سبب ''گیتا نجلی'' کا نام ضرور سن رکھا ہوگا۔انہیں یہ بھی شاید معلوم نہ ہوگا کہ اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان کی کس کس زبان میں ہوا اور کیسے کیسے جغادری اہل قلم نے کیا ہے۔اُردو میں بھی کئی تراجم ہیں مگر علامہ نیاز فتح پوری کے ترجمے کو فوقیت حاصل ہے۔

اگر آپ مناسب سمجھیں تو آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کے اس مضمون کو دوبارہ چھاپ دیں۔جس شخصیت کی ''تکذیب'' کی گئی ہے اُس کی ''تعریف'' بھی سامنے رہنا چاہیے (اور وہ بھی ''حقائق'' کی روشنی میں) اس مضمون کا اہم پہلو'' گاندھی جی سے ٹیگور کے مراسم'' بھی ہیں۔گاندھی جی کے بارے میں بھی ہم بے شمار غلط فہمیوں کے شکار ہیں۔یہ سب کچھ اس مخصوص ''نفرت'' کے نتائج میں ہے جو ''انگریز بہادر'' کی دوسو سالہ غلامی کی عطا ہے اور ہمارے نیم مذہبی اور نیم سیاسی رہنماؤں کا احسان۔شاید یہ غبار بھی کبھی چھٹ جائے اور ہمیں یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ انسانوں سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور نقطہ نگاہ کا ''فرق'' بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے لیکن اسے ''حرفِ آخر'' سمجھ لینا، دانش مندی کے خلاف ہے۔فی الحال میں صرف ٹیگور کے حوالے سے سوچ رہا ہوں کہ وہ ہمارے عہد کے بہت بڑے شاعر اور دانشور تھے۔ ہمیں کم از کم اپنی برادری اپنے قبیلے کے بڑے لوگوں کا احترام کرنا چاہیے اور یہ احترام اُن سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔اُمید ہے کہ آپ اپنے قارئین کو تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کے مواقع فراہم کریں گے۔

(حمایت علی شاعر۔کراچی)

۲۲ویں شمارہ میں ابنِ حسن صاحب کا سلسلہ مضامین بہ عنوان ''ادب اور معروضی حقیقت'' کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہوں۔ڈاکٹر شگفتہ حسین ان دنوں خوب لکھ رہی ہیں۔اُنہیں مبارک باد دیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے یہاں عورتیں ہر لحاظ سے مظلوم ہیں۔مولوی سید محمد مبین نقوی الہ آبادی کی تاریخ ریختی معہ دیوان جان صاحب میں بھی اسی حقیقت کا رونا ہے کہ مستورات کی زبان میں نثر میں کوئی کتاب اس زمانہ کی لکھی ہوئی نہیں ملتی ہاں طلسم ہوش ربا جلد اول سے اُس وقت کی زبان کا نمونہ (یہ) ملتا ہے۔ میں اپنے خط میں وہ نمونہ نہیں دے رہا ہوں لیکن میرے خلاف جسے عورتوں کی زبان تسلیم کیا گیا ہے وہ بھی صرف اندازِ بیان اور لہجہ کی بات ہے جسے اُس زمانہ کے مردوں کی تائید حاصل تھی۔نسائی تنقید ریختی کی زبان کو بھی نسائی ذہن کی اصلی authentic زبان نہیں مانتی۔ ہمارے یہاں نسائیت پر ایک طالب علم Ph.D. کی سطح کا کام کر رہا ہے۔میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے یہاں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے یہاں بھی ''نسائی زبان'' کی مثالیں تو کُجا، گزر تک نہیں ہوسکا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ''انگارے'' کے ذریعہ ترقی پسند ادب کی خدمت کرتے رہیں گے لیکن آپ غیر ترقی پسندانہ تحریروں پر اپنے اداریہ میں اپنے تحفظات ضرور نذر قارئین کیا کریں تا کہ ایسی تحریروں کی شمولیت کی غایت سمجھ میں آ سکے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ تحریروں کے نیچے فٹ نوٹس (Footnotes) کے بجائے ''انگارے'' کے اداریہ میں اپنی آرا (غیر ترقی پسندانہ تحریروں کے بارے میں) ضرور دیا کریں گے۔ میں اس رجحان کے خلاف ہوں کہ ترقی پسند یا لبرل رسائل و جرائد میں غیر ترقی پسندانہ تحریریں شامل نہ ہوں لیکن ان تحریروں سے حاصل ہونے والی ''آگہی'' اور ''میلانات'' کے بارے میں ترقی پسند فکر کے حوالہ سے گفتگو ضرور ہونی چاہیے اور شاید ادارتی نقد و نظر سے قارئین اپنے خیالات سپردِ قلم کرنے میں زیادہ انہماک کا مظاہرہ کریں۔

(ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔کراچی)

اس بار انگارے اپنے دامن میں بہت سی سوغات لایا ہے۔ترکی کے حوالے سے احمد نواز کے مضامین اور تراجم اہم ہیں انہیں چاہیے کہ ترکی شاعری کے بھی تراجم کریں افسانوں میں دونوں ہی اچھے لگے جب کہ مضامین میں ڈاکٹر شگفتہ حسین مجھے حیران کر گئیں کہ انہوں نے ''ریختی'' جیسی صنف پر مضمون لکھا ہے۔ڈاکٹر شگفتہ حسین کی جرأت و ہمت قابل داد ہے۔احمد رضوان کا مکالمہ بھی پسند آیا اور مجھے معلوم ہے۔

(فہیم شناس کاظمی۔نواب شاہ سندھ)

احمد نواز کی تحریر ''تُرکی کے صوفی شاعر یونس ایمرے اور خواجہ میر درد''، پروفیسر غلام حسین ساجد کی نگارش ''مجھے تو حیران کر گئی وہ'' اور ڈاکٹر شگفتہ حسین کی تحقیقی اور تنقیدی کاوش ''ریختی'' اس شمارے کی خاص عطا ہیں۔ناصر عباس نیّر کی بصیرت افروز اور نہایت معلومات افزا تحریر ''اہم ساختیاتی اصطلاحات'' مرتکز اور مربوط مطالعے پر مبنی ہے۔ ہمارے نوجوان ناقدینِ ادب میں ناصر عباس نیّر سرایت گیر نگاہ،

وسعتِ مطالعہ اور علمی قامت کے حوالے سے ممتاز اور نمایاں ہیں۔ معاصر تنقیدی اُفق کا یہ تابناک نام اپنی ہر تحریر میں عالمانہ دستگاہ کا ثبوت فراہم کر جاتا ہے۔ اگر آپ اُن کی ناقدانہ نگارشات ''انگارے'' کے لیے حاصل کرتے رہے تو قارئین کے لیے یہ ایک قیمتی سوغات سے کم نہیں ہوں گی۔ اُن کی یہ تحریر (جو اس شمارے میں شامل ہے) نقد و انتقاد کے ایک اہم دبستان کی بنیادی اصطلاحات کی تفہیم کے حوالے سے Key کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلاشبہ ان کا مطالعہ Extensive بھی ہے اور Intensive بھی۔

(غفور شاہ قاسم۔ میانوالی)

''انگارے'' شمارہ ۲۲ کے اداریہ میں ادبی سطح پر معیار بندی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور اشاروں کنایوں میں بہت عمدہ باتیں کی گئی ہیں۔ باقی معاملات کو چھوڑیں، صرف ادبی جرائد کی بات کریں تو یہ حیران کُن حقیقت ہے کہ ہمارے اعلیٰ ادبی جرائد کے مدیران نے بیک وقت دو انتہاؤں کو چھوا۔ بطور مدیر ایک معیار تک بھی پہنچے اور اپنی زندگیوں میں ہی سارے کیے کرائے پر پانی بھی پھیر دیا۔ حنیف رامے کی زندگی میں ہی ''سویرا'' ایک سہانی یاد بن گیا۔ ''نقوش'' کے محمد طفیل نے اپنا جانشین پیدا نہیں کیا۔ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے قریبی دوستوں کے سبب ''فنون'' اور ''اوراق'' برباد ہو گئے۔ ''سیپ'' کراچی ۱۹۷۸ء کے بعد بہترین مشاورت سے محرومی یا نسیم درّانی کی تن آسانی اُسے لے بیٹھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ڈاکٹر شگفتہ حسین کے ریختی سے متعلق مقالہ کے حواشی خاصے کی چیز ہیں۔ ناصر عباس نیّر نے ساختیات کی اصطلاحات کی وضاحت کر کے ساختیاتی تنقید اور پس ساختیات کی تفہیم کی جانب قدم اُٹھایا ہے۔ اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ ابن حسن کا مضمون ''ادب اور معروضی حقیقت'' بڑی عمدگی سے قسط وار آگے بڑھ رہا ہے لیکن مجھے زیادہ مزہ آیا غلام حسین ساجد کا پروین شاکر سے متعلق مضمون پڑھ کر۔ خاص طور پر درج ذیل بیانات نے تو عجیب کیفیت سے دوچار کر دیا۔ (۱) یہ کہ ۷۳-۱۹۷۲ء میں غلام حسین ساجد اپنے دَور کے جیّد عالم علی عباس جلالپوری کی معیت میں دفتر ''فنون'' جایا کرتے تھے۔ (۲) پروین شاکر نے غلام حسین ساجد کو بطور شاعر قبول کرنے میں پہل کی۔ (۳) جب غلام حسین ساجد نے یہ کہہ کر اُس کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کرنا چاہا کہ ''میں ہر اُس شاعر سے واقف رہنا لازم جانتا ہوں، جس نے ایک بھی اچھی غزل کہی ہے'' تو پروین شاکر نے کہا کہ وہ بھی اسی بنیاد پر غلام حسین ساجد سے متعارف ہے۔ (۴) غلام حسین ساجد نے لکھا ہے کہ ''خوشبو'' کی اوّلین اشاعت پر پروین شاکر نے یہ کتاب اُنہیں تحفے میں دی تھی اور اُنہوں نے اُسی وقت وہ کتاب کسی اور کو دے دی تھی۔ کسے؟ یہ نہیں بتایا۔ (۵) یہ کہ پروین شاکر سے ان کا تعلق بیس بائیس برس پر محیط ہے۔ (۶) غلام حسین ساجد نے کسی ملاقات کا ذکر کیا ہے جس میں پروین شاکر نے غلام حسین ساجد سے کہا ''تم لوگ خوش قسمت ہو۔ ہر نوع کے شعری تجربے کے لیے آزاد کیونکہ عوام کی تم لوگوں سے کوئی توقع وابستہ نہیں۔ رہی میں، تو وہ مجھے ہمیشہ بیس برس کی ایک خوش فکر لڑکی ہی

دیکھنا چاہتے ہیں، شاعرہ نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں شاید کبھی بڑی نہ ہو سکوں۔''

اس آخری بیان پر تو غلام حسین ساجد کے حافظے کی بھی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۸۷ء میں پروین شاکر کا ادا کردہ یہ طویل مکالمہ من وعن درج کر دیا حالاں کہ اتنا طویل مکالمہ یاد رکھنا بالعموم ممکن نہیں ہوتا۔ غلام حسین ساجد نے میرے حلقۂ احباب میں بھی رہنے کی بات کی ہے اور میں اس بات پر حیران ہوں کہ غلام حسین ساجد، پروین شاکر سے اتنے قریب تھے اور ہمیں اس کا علم ہی نہیں تھا۔ مزیدار بات یہ ہے کہ میرے قیامِ اسلام آباد کے دوران پروین شاکر نے بھی اس راز کو راز ہی رہنے دیا۔

احمد صغیر صدیقی صاحب کا قلم اِن دنوں خوب رواں ہے۔ اُن کی شاعری اور تنقیدی آراء (خاص طور پر انور سدید سے متعلق اُن کا مضمون۔ سبحان اللہ!) کے علاوہ اب اُن کا تازہ افسانہ: ''اِنکی'' بھی پڑھ لیا۔ یہ ایک انوکھا بیانیہ ہے۔ اور یانہ فلاشی کا ترجمہ خالد سعید عمدگی سے کر رہے ہیں۔ سہوِ کمپوزر سے تازہ شمارے میں قاضی حبیب الرحمٰن کی دو غزلیں قدرے مختلف نام سے شائع ہو گئیں۔ قاضی صاحب کی پہلی غزل تو غضب کی ہے، واہ وا۔

(مرزا حامد بیگ۔ لاہور)